قیمت : 10/- روپے

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

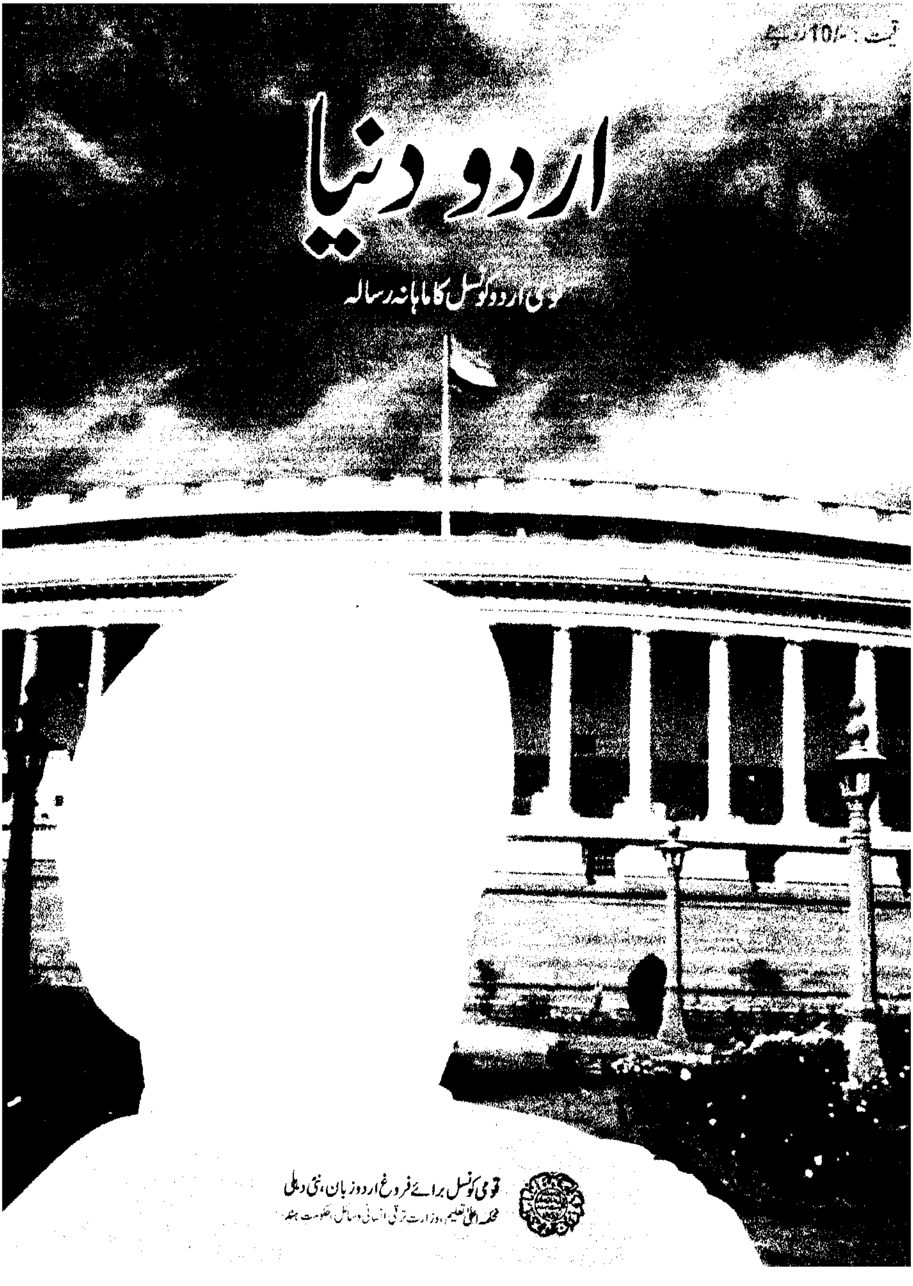

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

اردو کے مشہور اور مستند شاعر اور نقاد **خلیل الرحمٰن اعظمی** کی اہم کتابیں جو ایک عرصے سے نایاب تھیں، قومی اردو کونسل نے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ ہر اچھی اردو لائبریری میں ان کتابوں کی موجودگی ضروری ہے

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

اپنے وقت کی سب سے اہم ادبی تحریک کا بھرپور تعارف جو ترقی پسند تحریک کے نام سے 1935 میں شروع ہوئی اور پندرہ سے بیس سال کی مدت میں جس نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔۔ اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غیر جانبداری کے ساتھ تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور تحریک سے وابستہ اہم قلمکاروں کے فکر و فن پر بھی گفتگو کی ہے۔

صفحات :410، سائز ڈیمائی، قیمت : -/241 روپے

مقدمۂ کلام آتش

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری پر یہ مبسوط مقالہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1948 میں، جب وہ بی. اے. کے طالب علم تھے، تحریر کیا تھا۔ جب یہ مقالہ بالاقساط ''نگار'' میں شائع ہوا تو نیاز فتحپوری نے اسے اپنے ادارتی نوٹ میں سراہتے ہوئے لکھا کہ '' جناب اعظمی جس دقتِ نگاہ اور امعانِ نظر سے کام لے رہے ہیں، وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی بھی صاحبِ قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔'' بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللہ، وحید قریشی اور دیگر کئی اکابر نے بھی اس مقالے پر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

صفحات: 134، سائز ڈیمائی، قیمت:-/139 روپے

زاویۂ نگاہ

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں پانچ اہم مضامین پانچ اہم شخصیتوں سرسید، ابوالکلام آزاد، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور اختر الایمان کے حوالے سے ہیں۔ ایک مضمون میں '' اردو تنقید کے مسائل '' پر گفتگو ہے اور ایک مضمون کا عنوان ہے '' اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ '' باقی دو مضامین ہیں: '' اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ '' اور '' دو نئے شعری مجموعے ''۔

صفحات: 184، سائز ڈیمائی، قیمت:-/138 روپے

فکر و فن

خلیل الرحمٰن اعظمی مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ادب کا براہِ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیت کو سمجھنے اور اس کا معیار متعین کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے دس مضامین شامل ہیں جو بالترتیب، غالب، ظفر، خواجہ میر درد، حسرت، داغ، مومن، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی کے فکر و فن کے محاسبے پر مبنی ہیں۔

صفحات: 205، سائز ڈیمائی، قیمت:-/151 روپے

مضامینِ نو

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں مرتب کیا۔ اس میں شخصیتوں پر بھی مضامین ہیں، عصری ادبی صورت حال کا بھی ذکر ہے، کچھ مسائل پر اظہار خیال ہے اور کچھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصرے انھی کتابوں پر ہیں جن کی اشاعت کے بعد ادبی منظرنامے میں کچھ چہل پہل نظر آئی اور مسائل بھی وہی اٹھائے گئے ہیں جو اہم تھے اور اہل نظر کی توجہ کے طلب گار۔

صفحات: 240، سائز ڈیمائی، قیمت:-/172 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، وِنگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد-11، شمارہ-6، جون 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103381, 26103938
26179657 فیکس:26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون:26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس، بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 6

زبان اور تعلیم

● اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم .... وہاب قیصر 7
● راجستھانی بولی/زبان .... فیروز احمد 11
● اردو میں مستعمل عربی الفاظ .... غازی علم الدین 14
● اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ .... عطا عابدی 20

ادب اور صحافت

● ایک چراغ تھا نہ رہا .... آل احمد سرور 24
● پریم چند کا ایک نایاب مضمون ''اتفاق طاقت ہے'' .... پردیپ جین 27
● ہندوستان کی اردو صحافت— کچھ توجہ طلب امور .... یوسف کمال 30
● کلیات اسعد بدایونی— چند توضیحات .... رضوان الرضا رضوان 33

تہذیب اور ثقافت

● دہلی کی ایکولوجی .... اقبال محی الدین 35
● ہندوپاک کے ثقافتی رشتے .... حمید سہروردی 38

سائنس اور ٹیکنالوجی

● موبائل فون کے انسانی صحت پر اثرات .... جاوید کامٹوی 40
● کانچ کے گولے میں اجالا کیوں کر قید ہوتا ہے .... کے۔ صلاح الدین 42

کیریئر

● شمالی ہند کی ایک اہم درس گاہ— دہلی یونیورسٹی .... ابن کنول 44
● روزگار کی تلاش کے جدید طریقے .... محمد اعجاز 47

روبرو

● شوکت حیات سے ایک ملاقات .... ممتاز عالم رضوی 49

ہماری مطبوعات سے

● فانی کی شاعری .... ظہیر احمد صدیقی 53

اردو خبرنامہ .... ادارہ 57

تبصرہ و تعارف 71

● جامع تاریخ ہند .... محمد معظم الدین
● ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں .... رغبت شمیم
● معالجات .... نعمان انور
● کائنات علی باقر .... شہاب ظفر اعظمی
● ہم کتنے ہاتھوں بکے .... معید رشیدی
● آنگن میں چاند .... اسد رضا

بچوں کا گوشہ

● آب حیات .... محمد رفیع انصاری 77

آپ کی بات

■ **ڈاکٹر علی رفاد فتیحی، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی**

شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے میں آپ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرری پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر مجھے قطعاً تعجب نہیں ہوا۔ آپ کی ڈائرکٹر شپ کے پہلے دور میں اردو بولنے والی کمیونٹی نے یہ مشاہدہ کرلیا تھا کہ آپ کتنے روشن دماغ ہیں اور اردو زبان کی تیز رفتار ترقی کے لیے آپ کے ذہن میں کیا واضح منصوبے ہیں۔ اگر آپ کے مسلسل عملی اقدامات اور اپنی منصبی ذمے داریوں سے آپ کے ذہنی اور عملی شغف کو دیکھا جائے تو واضح طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ کے سامنے اردو کے مستقبل کا ایک روشن خاکہ موجود ہے۔ اردو بولنے والی کمیونٹی کے لوگ، اگر وہ اپنی زبان کی ترقی چاہتے ہیں، وہی ذہنی لگن اور عملی جذبہ پیدا کریں، جو آپ میں پایا جاتا ہے۔ آپ نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے دوراندیشی اور تجدد پسندی کی جو مثال قائم کی وہ اظہر من الشمس بھی ہے اور نئی نسل کے لیے قابل تقلید بھی۔

مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا جو تھوڑا بہت موقع ملا، اس کی روشنی میں میں امید کرتا ہوں کہ آپ کے دوبارہ اردو کونسل میں آجانے سے اردو زبان اور لسانیات کو فروغ حاصل ہوگا۔ میری بہترین خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ میں ایک بار پھر شعبۂ لسانیات اور اس کے اسٹاف کی جانب سے اردو کونسل میں آپ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کی کامیابی اور کامرانی کا متمنی ہوں۔

■ **خلیق انجم، اردو گھر، اردو گھر مارگ، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-2**

بھٹ صاحب آداب! بار بار آپ کو ٹیلی فون کرتا ہوں مگر رابطہ قائم نہیں ہوتا۔ میں اچھی طرح واقف ہوں کہ اس وقت آپ کی مصروفیات غیر معمولی ہوں گی۔ میں آپ کو قومی کونسل میں دوبارہ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ زندگی میں اسی طرح کامیاب اور خوش وخرم رہیں۔

■ **کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی، آئی پی-16، سیکٹر-14، پنچکولہ**

میں ٹیلیفون پر تو آپ کو مبارکباد دے چکا ہوں لیکن اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں یہ چند سطور لکھ کر آپ کو دوبارہ مبارکباد پیش کررہا ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کرپائیں گے کہ مجھے آپ کی کونسل میں واپسی پر کتنی مسرت ہوئی ہے۔ میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں دلی آرہا ہوں۔ آپ سے ملاقات کروں گا۔ مجھے آپ کو اپنی دو نئی کتابیں بھی پیش کرنی ہیں، جن میں سے ایک کا تعلق کشمیر سے ہے۔

■ **سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری، علامہ انور شاہ روڈ، نزد عیدگاہ، دیوبند**

منصب کی بازیابی پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے، حق بحق دار رسید، خدا کا شکر ہے کہ آں مکرم کو باعزت سرخ رو فرمایا۔ دعا ہے حق تعالیٰ آپ کے مناصب میں اضافہ اور دوام نصیب فرمائے اور ہر طرح کی عافیت سے سرفراز فرمائے۔

■ **ایس. ایم. ظفر، عاکف کی محفل (ماہنامہ)، کوچہ تاراچند، دریا گنج، نئی دہلی**

قومی اردو کونسل میں بحیثیت ڈائرکٹر دوبارہ آپ کے تقرر پر مجھے دلی خوشی

● 29 اپریل کو ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے ایما پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ دوبارہ سنبھال لیا۔ وہ بہ حیثیت ڈائرکٹر اقلیتی تعلیم (وزارت ترقی انسانی وسائل) بھی بدستور خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ کے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا عہدہ دوبارہ سنبھالنے پر پوری اردو دنیا میں مسرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں جو خطوط اب تک موصول ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ اس کالم میں شامل کیے جارہے ہیں۔ جن حضرات نے اپنی خوشی اور خیر سگالی کا اظہار کیا ہے ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

پروفیسر شہریار، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، جناب جی. ڈی. چندن، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر خواجہ اکرام، ڈاکٹر غضنفر علی، ڈاکٹر مظہر مہدی، جناب مرغوب حیدر عابدی، جناب شاہد ماہلی، پروفیسر سلیم قدوائی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، جناب نصرت ظہیر، جناب عارف اقبال، جناب شمس اقبال، جناب شاہد علی خاں، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر انوار رضوی، ڈاکٹر رحیل صدیقی، جناب آصف نعیم، ڈاکٹر احمد سجاد، جناب جلیل پاشاہ، جناب شاہد بڈگانوی۔ دہلی اور بیرون دہلی سے اور بھی بہت سے حضرات نے کونسل کے لیے اپنی نیک خواہشات بھجوائی ہیں اور کونسل کی کارکردگی میں مزید بہتری آنے کی توقعات کا اظہار کیا ہے، ان سب کا ادارے کی طرف سے فرداً فرداً شکریہ۔

ہوئی ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ اس رب عزوجل نے آپ کو سرخ رو فرمایا۔ یہ آپ کے اس کام کی اصل پذیرائی ہے جو آپ نے اپنے سابقہ دور میں قومی اردو کونسل کے لیے کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے پہلے دور میں جس قدر اردو کی نایاب کتب قومی کونسل نے شائع کیں کوئی دوسرا کر سکا ہو۔ آپ نے کمپیوٹر کے حوالے سے اردو زبان کی بقا کے لیے جو کوشش کی اور جس قدر سینٹر قائم کیے اس سے جن لوگوں کو روزی ملی ان کی دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔

اردو اخبارات اور رسائل کو جو تعاون آپ کے زمانے میں ملا اس سے آگے کوئی دوسرا سوچ بھی نہیں سکا۔ پورے اردو حلقوں کو اس کا احساس ہے۔ میں نے جگہ جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ حمید اللہ بھٹ صاحب نے اردو زبان کے فروغ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں، وہ دوسرے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ ایک نئے جوش اور نئی امنگ کے ساتھ ایسے نئے پروگرام پیش کریں گے جو اردو زبان کی بقا کے لیے ہمیشہ آپ کے حوالے سے پہچانے جاتے رہیں گے۔

■ **ڈاکٹر محمد احسن، ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، آرسی بھوپال**

قومی اردو کونسل کی دوبارہ سربراہی پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں قبول فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ قومی اردو کونسل کے کھوئے ہوئے وقار کو آپ ضرور بحال کریں گے اور کونسل آپ کی سربراہی میں ترقی یافتہ زمانے کے چیلنج کا سامنا کرے گی۔

میری تمام نیک خواہشات آپ کے اور آپ کی ٹیم کے ساتھ ہیں۔

■ **نذیر فتح پوری، مدیر ''اسباق''، سائرہ منزل، لوح گاؤں روڈ، پونہ**

محترم چندر بھان خیال کی جانب سے یہ خوش خبری ملی کہ آپ قومی اردو کونسل کے اپنے سابقہ عہدے پر پھر سے جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ یہ جان کر واقعی دلی مسرت ہوئی۔ میں اس مبارک موقع پر ادارہ ''اسباق'' کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حسب سابق آپ کی رہنمائی میں قومی اردو کونسل ترقی کی منازل طے کر کے اردو کے فروغ میں چار چاند لگائے گی۔

■ **نیاز سلطانپوری، سمیع پبلی کیشنز، بھٹی جرولی، سلطان پور، یوپی**

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے موقر عہدے پر دوبارہ تقرری پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیے۔ امید کہ آپ حسب سابق کونسل کی سرگرمیوں کو نئی زندگی بخشیں گے۔

■ **محمد فاضل، احمد کیمپن، سینٹر انچارج، نگوی بازار، روشن باغ، الہٰ آباد**

یہ خبر موجب مسرت ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر کا عہدۂ جلیلہ محترم حمید اللہ بھٹ صاحب کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ادارہ وصیہ العلوم انفارمیشن ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ الہٰ آباد موصوف کی خدمت میں تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے اور یہ امید کرتا ہے کہ آپ کی سربراہی میں قومی اردو کونسل اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت میں نہ صرف کامیاب ہوگی بلکہ نئی سربلندیوں کو بھی حاصل کرے گی اور اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کی راہوں پر برق رفتاری سے گامزن ہوگی (انشاء اللہ)۔ اس کے ساتھ جملہ اراکین کونسل کو بھی مبارکباد کہ ان کو ایک مخلص، فعال اور ہر دل عزیز قیادت نصیب ہوئی ہے۔ خداوند عالم اس سلسلے کو باقی اور دراز رکھے (آمین)۔

■ **خلیل احمد، بچوں کا گھر، کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی-110002**

دوسری بار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے آپ کی مخالفت کی تھی اور آپ پر الزام تراشیاں کی تھیں، یہ ان کے منھ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ اللہ کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ آپ پہلے کی طرح اس ادارے کو سرگرم اور فعال بنائیں گے تاکہ قوم کے بچے اس ادارے سے بخوبی مستفید ہو سکیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے اور آپ ہمت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیں۔

■ **ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ''عدلیہ پبلیکیشنز''، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت مئی 2009 باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ حسب معمول معیاری، پرکشش اور معلوماتی ہے۔ اداریے میں اردو زبان و ادب اور اس کی تعلیم کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے وہ نہ صرف قابل غور ہے بلکہ اس پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ دیگر مشمولات میں ''اردو۔ انگریزی لغت مجتہدی'' از اشرف رفیع، ''اردو زبان اور علاقائی بولیاں'' از نسیم احمد نسیم، ''الہٰ آباد کا ادبی ماحول منظر پس منظر'' از علی احمد فاطمی اور ''تنقید کا منصب'' از ابوبکر عباد سمیت سبھی مضامین اہم، کارآمد اور معلوماتی ہیں۔

گذشتہ دنوں اخبارات سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے پھر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا ہے جو خوش آئند ہے کیونکہ قومی اردو کونسل کی موجودہ فعالیت دراصل موصوف کی ہی دین ہے امید کہ ان کی واپسی سے کونسل کی سرگرمیوں میں مزید تیزی پیدا ہوگی۔ موصوف کی بحالی پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

■ **ڈاکٹر درخشاں زریں، لکچرار، شعبۂ اردو، خضر پور کالج، خضر پور، کولکاتا**

''اردو دنیا'' کا مطالعہ میں بڑے شوق سے کرتی ہوں۔ اس کے تمام مشمولات نہایت اہم، معلومات افزا اور تبصرے متاثر کن ہوتے ہیں۔ پیش کش کے اعتبار سے بھی رسالہ قابل توجہ ہے۔

مئی کا شمارہ میرے زیر نظر ہے لیکن اس شمارے پر اپنا تاثر ظاہر کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ روزنامہ ''آزاد ہند'' 29 اپریل کے شمارے میں یہ

خبر پڑھنے کو ملی کہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ دوبارہ سنبھال لیا ہے۔ یہ خبر پوری اردو دنیا کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی سرگرمیاں مزید بڑھیں۔

''اردو دنیا'' مئی 2009 کے تمام مشمولات دل پذیر اور معیاری ہیں۔ ''ہماری بات'' کے تحت رالف رسل کی اردو اور اس کی حفاظت سے متعلق مختصر مگر جو اہم رائے پیش کی گئی ہے اس کی جانب ہمیں ضرور توجہ دینی چاہیے۔ مضامین میں اشرف رفیع، نسیم احمد نسیم، علی احمد فاطمی، ابوبکر عباد اور معید رشیدی کی تحریروں نے متاثر کیا۔ اشرف رفیع نے سید یعقوب میراں مجتہدی کی جس لغت کا ذکر کیا ہے، وہ اردو لغت نگاری کی روایت میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں ایسی لغت کی ضرورت ہے۔ نسیم احمد نسیم نے اپنا مضمون ''اردو زبان اور علاقائی بولیاں'' (بھوجپوری، نیپالی، تھروئی) محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ لسانی مطالعے کی روایت میں اکثر پوربی بولیوں کی اہمیت اور اس کی شیرینیت کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے جب کہ ان علاقوں میں مذکورہ بولیوں کی خاص اہمیت ہے۔

علی احمد فاطمی سے اردو کی ادبی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ اردو زبان و ادب کے ارتقا میں الٰہ آباد کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ فاطمی صاحب نے بڑے مؤثر انداز میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ''تنقید کا منصب'' میں ابوبکر عباد نے تنقید اور تخلیق کے باہمی رشتوں کو خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ معید رشیدی نوجوان لکھنے والوں میں ہیں۔ ان کا مضمون ''وحشت کی غزل'' بعض جہتوں سے کافی اہم اور لائق توجہ ہے۔ وحشت کا ذہنی سفر کس طرح اپنی ارتقائی منزلوں تک پہنچا، معید رشیدی کا مضمون پڑھ کر اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ محمد یحییٰ جمیل کے مضمون ''پتھر بولتے ہیں'' اور ایم مبین کے ''انٹرنیٹ اور اردو'' کے علاوہ دیگر مشمولات بھی کافی معلومات افزا اور دلچسپ ہیں۔

قومی اردو کونسل کی مطبوعات سے ماخوذ اقتباسات بھی کافی معیاری ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں سید احتشام حسین اور اسلم پرویز کی کتابوں سے اخذ شدہ تحریریں کافی مفید ہیں۔ ان کے مطالعے سے 1857 کے غدر، اردو ادب پر اس کے اثرات اور مغلیہ سلطنت کے زوال میں گھری بہادر شاہ ظفر کی شخصیت سے جڑی اہم باتوں سے ہم روشناس ہوئے۔ ''اردو خبرنامہ'' کے ذریعے اردو دنیا کی موجودہ صورتِ حال سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔ بچوں کے گوشے میں ''انوکھے معمار'' کا مطالعہ بھی الگ مزہ دے گیا۔ تبصرہ و تعارف میں رغبت شمیم، عبدالرب اور ابوظہیر ربانی نے تبصرے کا حق ادا کیا ہے۔ اسی شمارے میں میرا بھی ایک تبصرہ شریک اشاعت ہے اس کے لیے میں ادارے کی ممنون ہوں۔

■ **شاغل ادیب، ذیب منزل، صدیق نگر، مشیرآباد، حیدرآباد**

''اردو دنیا'' کا شمارہ بابت اپریل 2009 باصرہ نواز ہوا۔ اب کی بار حصۂ ادب بہت بھاری ہے۔ نئی ہندی کویتا کے منفرد کوی آں جہانی سدیپ بنرجی پر پروفیسر صادق کا مضمون بہت اچھا ہے۔ بنرجی کی مادری زبان بنگالی تھی۔ انھوں نے تعلیم ہندی میڈیم سے حاصل کی۔ مگر اردو کے رسم الخط سے ناواقفیت کے باوجود اپنی ہندی شاعری میں اردو کے لاتعداد الفاظ جس فنکارانہ انداز میں استعمال کیے وہ انھی کا حصہ ہے۔ یہ ان کے لیے ایک عطیہ خداوندی ہے۔ پروفیسر صادق نے ان کی جس حق گوئی اور بے باکی کا ذکر کیا ہے وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ مضمون ''پریم چند اور آریہ سماج'' بھی اچھا ہے۔ آریہ سماج واقعی ایک غیر فرقہ پرست تعمیری ادارہ تھا۔ پریم چند اس ادارے کے مقاصد سے صرف متاثر ہی نہیں رہے بلکہ اپنی بیشتر تصانیف میں ان کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جناب پردیپ جین پریم چند پر قابلِ قدر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور انھوں نے پریم چند کی بہت سی گم شدہ تخلیقات کو نہایت عرق ریزی سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ ''غالب کا ایک متنازعہ خط'' میں ڈاکٹر ابرار رحمانی نے سابقہ محققین اور ان کے مباحث کا جائزہ لیتے ہوئے اس خط کے تعلق سے نقد و نظر کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ جناب سرورالہدیٰ کا مضمون بھی متوجہ کرتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کی برتری کی نمائش کی خاطر بہادر شاہ ظفر ہی کے ساتھ نہیں بلکہ مرزا غالب اور مومن خان مومن کے ساتھ بھی ادبی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جناب محمد شاہد پٹھان نے اپنا مضمون ''حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبی و انتقادی تصورات'' واقعی بڑی دقت نظری سے لکھا ہے۔ مضمون کے آخر میں مرقوم حواشی و حوالے ان کی تحقیق اور ان کے مطالعے کی وسعت کے غماز ہیں۔ جناب فیاض رفعت کا مضمون مختصر مگر پرمغز ہے۔ جناب ملک زادہ جاوید کا مضمون بھی خوب ہے۔ لکھنؤ کی ان تین شخصیتوں میں سے سورگباشی رام لعل کا اس غریب پر بڑا کرم رہا ہے۔ ''زبان و تعلیم'' کے تحت مشمولہ دونوں مضامین بھی بے حد پسند آئے۔

■ **ڈاکٹر محمد ناظم علی صدر شعبۂ اردو گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی، اپریل 2009 کا شمارہ بروقت وصول ہوا۔ اس کی اشاعت کی پابندی مثالی ہے کہ میں ہر ماہ کی 31 تاریخ کو اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوتا ہوں۔ جب ہاتھ میں آجاتا ہے تو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میں صمیم قلب سے ''اردو دنیا'' کے مدیر اور دیگر اسٹاف کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ اردو قارئین کو عصری علوم و فنون سے آشنا کر رہے ہیں اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھال رہے ہیں۔ قاری زندگی اور زمانے کی بدلتی قدروں سے میل کھاتے مضامین سے عصری شعور و آگہی حاصل

کرتا ہے۔ ''اردو دنیا'' 21ویں صدی کا نقیب رسالہ ہے۔ قاری جو چاہتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ ادب، سیاست، زبان، تعلیم، سائنس وٹیکنالوجی، ماحولیات وغیرہ۔ ''آپ کی بات'' کالم میں قارئین کے خطوط سے رسالے کے وزن و وقار کی پہچان ہوجاتی ہے۔ یہ ایک طرح کا تبصراتی کالم ہے جس میں تنقیدی پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ ''ہماری بات'' میں اردو کی ہمہ گیری و ہمہ جہتی اور اس کی عالمی حیثیت پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اردو کی اصل اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی کارفرمائی پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو ایک سیکولر زبان قرار دیا گیا ہے اور اردو کے قومی تاریخی کردار کو بھی اجاگر کیا گیا ہے لیکن آخری سطور میں اہم نکتے کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اردو والے نئی نسل کو اردو پڑھائیں۔ جب نئی نسل اردو سیکھ لے گی تو یہ زبان تاحشر زندہ رہے گی اور نسل در نسل منتقل ہوتی رہے گی۔ میری دانست میں اردو کی ترویج و نشوونما میں نئی نسل اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ ہر خاندان گرماتی تعطیلات میں اپنے بچوں کو صرف ایک ماہ میں اردو سکھا سکتا ہے۔ امام اعظم نے فاصلاتی تعلیم کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے کہ Dropout بچے یا ایسے لوگ جو روزمرہ زندگی میں مصروف رہتے ہیں ان کے لیے سب سے بڑا وسیلہ فاصلاتی تعلیم ہے۔ محمد جمال مصطفےٰ نے اردو اور ہندی کے باہمی رشتوں کا ذکر کیا ہے، مضمون لسانیات اور زبان کے تعلق سے پرمغز ہے اور معلومات کا مخزن ہے۔ پروفیسر صادق نے سدیپ بنرجی کی ہندی کویتا سے بحث کی ہے۔ پردیپ جین نے پریم چند کی آریہ سماج سے ذہنی وابستگی پر روشنی ڈالی ہے۔ ابرار رحمانی نے ایک متنازعہ خط کا ذکر کیا ہے۔ سرورالہدیٰ اور شاہد پٹھان کے مضمون معلوماتی ہیں۔ فرزانہ اسد نے ماحول کی آلودگی کے اسباب بیان کیے ہیں۔ دراصل ہم خود سماجی ضرورتوں کے تحت ماحولیاتی آلودگی پھیلاتے ہیں۔ کبیر احمد جائسی کے مضمون سے نئی معلومات حاصل ہوئی اور روزہ، خدا وغیرہ لفظ کہاں سے آئے معلوم نہیں تھا۔

اردو خبرنامے سے عالمی سطح پر اردو کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ''تبصرہ وتعارف'' کا کالم بہت خوب ہے۔ اس میں شائع ہونے والے تبصرے جامع مبسوط اور معیاری ہوتے ہیں۔ بچوں کے گوشے میں مزید دو صفحے کا اضافہ ہونا چاہیے۔ بچوں کے ادب پر ہمارے ہاں ہمیشہ کم توجہ کی گئی ہے۔

■ ڈاکٹر انوراد یب، ابراہیم منزل، مسدی محلہ، راطلپور، آسنسول

''اردو دنیا'' (جنوری 2009) زیر نظر ہے۔ اس شمارے میں جناب مارکنڈے کاٹجو کا مضمون ''ہندوستان میں اردو کے ساتھ ناانصافی'' خصوصی طور پر دعوت فکر دیتا ہے۔ اس مضمون کے تعلق سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مضمون نگار کا ارشاد ہے: ''مسلمانوں نے اپنی حب الوطنی اور ہندو بھائیوں سے اتحاد ظاہر کرنے کے لیے اردو پڑھنا چھوڑ دیا۔'' موصوف کے اس خیال سے حقیقت کا کوئی تعلق نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد حکومتوں کی متعصبانہ پالیسیاں اس کی ذمے دار ہیں۔ اردو کا رشتہ معاش سے ختم کردیا جس کی وجہ سے نئی نسل اردو میں اپنا مستقبل نہ دیکھ کر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

مضمون نگار آگے فرماتے ہیں ''اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ اردو کو سنسکرت سے جوڑیں اور اسے تنہا نہ چھوڑیں، اس طرح سے اردو فرقہ وارانہ زبان کی حیثیت سے داغدار نہیں ہوگی۔'' موصوف کا یہ مشورہ وضاحت طلب ہے۔

ہندو فرقہ پرستوں نے اپنی سیاسی مقصد برآری کے لیے اردو کو مسلمانوں سے جوڑ کر جس قسم کی لسانی منافرت پیدا کی ہے اس کا ختم ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ اردو کی آبیاری میں غیر مسلموں کا زبردست حصہ رہا ہے۔ لیکن آج کے غیر مسلم اردو داں پرانی نسل کے باقیات ہیں۔ ان کے بعد ان کے گھروں سے اردو کا رشتہ قائم رہنا بے حد مشکل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی زبان کا تعلق مذہب سے نہیں لیکن اردو کا تعلق معاش سے نہ جڑا ہونے سے غیر اردو داں حضرات اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ انھوں نے اردو اس لیے پڑھی تھی کہ وہ وقت کا تقاضا تھا۔ اردو داں کو عزت کے ساتھ خوشحالی بھی حاصل تھی۔

موصوف نے اردو شعرا کے کلام کو اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ بظاہر یہ مشورہ اردو کی ترویج کے لیے مفید معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اردو کے مفاد کے منافی ہے۔ اردو زبان کی بقا کے لیے اس کا رسم الخط ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کا تصور ممکن نہیں۔ دونوں کا تعلق روح اور جسم کا ہے۔ اردو رسم الخط کے بغیر اردو زبان بے جان ہوجائے گی۔

آزادی کے 62 سال بعد بھی اردو ہندی کا مسئلہ حل نہ ہونے کی وجہ حقیقت پسندی سے گریز ہے۔ ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو ہندی دو مستقل زبانیں ہیں۔ اردو ہندی کی شیلی نہیں۔ اردو کی بقا اور فروغ سے دلچسپی رکھنے والوں کو دونوں زبانوں میں تعاون کا ماحول پیدا کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ باہمی تعاون کی یہ فضا ہی اردو اور ہندی کے تنازعے کو ختم کرسکتی ہے۔

■ کمال اختر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کی اہمیت اور افادیت دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اس میں خبروں، تبصروں کے علاوہ زبان، ادب، سائنس اور ماحولیات پر معیاری اور بصیرت افروز مضامین تواتر کے ساتھ پڑھنے کو ملتے ہیں۔

□□□

ہماری بات

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان کی پندرھویں لوک سبھا کے انتخابی نتائج سامنے آگئے ہیں اور ان نتائج نے ان تمام قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کردیا ہے جو انتخابات کا عمل شروع ہونے سے قبل اور انتخابات کے دوران بعض حلقوں کی جانب سے کی جارہی تھیں۔ ان قیاس آرائیوں کے پیچھے جو اندازے کارفرما تھے وہ زمینی نہیں، ہوائی قسم کے تھے اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ اس مرتبہ بھی سابقہ لوک سبھا کے انتخابات کی طرح قومی سے زیادہ علاقائی مسائل کو اہمیت حاصل رہے گی یا پھر فرقہ وارانہ جذبات انتخابی نتائج کو متاثر کریں گے۔

ہندوستان مختلف مذاہب، مختلف ثقافتوں اور مختلف نسلی گروہوں کا گہوارہ ہے۔ اس ملک کی خوبصورتی اسی رنگارنگی میں ہے لیکن اس رنگارنگی میں اگر ہم آہنگی نہ ہوتو افتراق و انتشار کے بدنما مظاہر سامنے آتے ہیں۔ کہیں مذہب وثقافت کے نام پرتو کہیں ذات پات اور زبانوں کے حوالے سے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سیاسی قسمت آزماؤں کی نظر عام طور پر قومی اور ملکی مفادات سے زیادہ نجی مفادات پر مرکوز رہتی ہے۔ پندرھویں لوک سبھا کے انتخابی نتائج نے اس ذہنیت کی حوصلہ شکنی کی ہے اور یہ ملک وقوم کے مفاد میں ایک نیک شگون ہے۔

ہندوستانی رائے دہندگان مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے ان سیاسی مہم جو طاقتوں کو مسترد کردیا جو فرقہ پرستی، علاقائی تفریق یا ذات برادری کی اونچ نیچ جیسے ہنگامی اور جذباتی مسائل کو غیرضروری اہمیت دے کر عوام کو گمراہ کرتی رہی ہیں اور جن کا واحد مقصد اقتدار حاصل کرنا رہا ہے۔ یوں تو مسند اقتدار تک رسائی حاصل کرنا ہر سیاسی جماعت کا مطمح نظر ہوتا ہے کہ اقتدار میں آئے بغیر وہ اپنے سیاسی عزائم کو روبہ عمل نہیں لاسکتی لیکن اگر صرف حصولِ اقتدار ہی واحد مقصد بن کر رہ جائے اور ملک وقوم کی تعمیر وترقی کے مقاصد پس پشت جا پڑیں تو وہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جو گذشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں متعدد بار سامنے آئی ہے۔ مختلف الخیال جماعتیں اگر جمہوری نظام کی تقویت اور استحکام کے لیے ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہوتی ہیں تو اس میں کچھ قباحت نہیں، خرابی تب پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنی مشترکہ ذمے داری کا احساس نہ کریں اور آزمائش کے موقعوں پر پیچھے ہٹ جائیں۔

کانگریس ملک کی سب سے قدیم سیاسی جماعت ہے جس نے گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد جیسے قومی رہنماؤں کی سربراہی میں ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی اور ایک صبرآزما جدوجہد کے بعد اس میں کامیابی حاصل کی۔ آزادی کے بعد ملک کی زمامِ اقتدار بھی سب سے زیادہ مدت تک کانگریس ہی کے ہاتھوں میں رہی اور اس نے اپنے دور اقتدار میں منصوبہ بند طریقے سے ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لیے جو کوششیں کیں، انھی کا ثمرہ ہے کہ دنیا کے نوآزاد اور ترقی پذیر ملکوں میں آج ہندوستان سب سے آگے ہے۔

حالیہ انتخابات میں کانگریس نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، اس کا سہرا بلاشبہ اس کی موجودہ قیادت کے سر ہے جس کے عملی اقدامات سے پارٹی نہ صرف اندرونی طور پر مضبوط ہوئی بلکہ عوام تک بھی مثبت پیغام گیا۔ عوام بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس پیغام پر لبیک کہی اور کانگریسی امیدواروں کو کامیاب کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 17 مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے کانگریس سربراہ مسز سونیا گاندھی نے رائے دہندگان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاں اس کامیابی پر اطمینان کا اظہار کیا وہیں انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کامیابی سے ہماری ذمے داریوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں ملک کے پس ماندہ طبقوں اور ان لوگوں کے بارے میں خاص طور پر سوچنا ہے جو ترقی کے ثمرات سے ابھی تک محروم ہیں۔ اسی میٹنگ میں وزیراعظم من موہن سنگھ نے عالمی اقتصادی بحران اور پڑوسی ممالک میں ہونے والی سیاسی اتھل پتھل کو نئی حکومت کے لیے سب سے بڑا چیلنج قرار دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں جو وعدے کیے تھے وہ انھیں پورا کرنے کی پابند ہے اور اس سلسلے میں اگر کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں تو وہ انھیں دور کرے گی۔

اس وقت ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کو جو کٹھن مسائل درپیش ہیں ان میں ایک مسئلہ دہشت گردانہ سرگرمیوں کا بھی ہے جو باہمی خیرسگالی اور تعمیروترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ نئی حکومت اس مسئلے کے حل کو بھی اپنی ترجیحی فہرست میں رکھے گی اور امن واماں کی وہ فضا بحال ہوگی جس میں جمہوریت کا شجر سایہ دار برگ وبار لاتا ہے۔

□□□

وہاب قیصر

اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم

اردو زبان اور اردو ذریعۂ تعلیم پر ملک کی آزادی کے کچھ مثبت اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ ملک کی تقسیم اور اردو کا پاکستان کی قومی زبان قرار پانا اس کا موجب بنا۔ اردو ذریعۂ تعلیم رکھنے والی ملک کی واحد یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم انگریزی قرار دیا گیا۔ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید نے بھی اس زبان پر کاری ضرب لگائی۔ سوائے جموں اور کشمیر کے ملک کی کسی ریاست میں اردو کے لیے گنجائش باقی نہیں رہی۔ ریاستی تنظیم نو کے بعد ہر ریاست نے اپنی اپنی ریاستی زبان کے فروغ کے لیے جو متعدد اقدامات کیے، ان میں ذریعۂ تعلیم کے لیے ریاستی زبان کو ترجیح دینا بھی تھا۔ ریاستی حکومتیں اپنے دفاتر میں ملازمت کے لیے انہی نوجوانوں کا انتخاب کرنے لگیں جو وہاں کی سرکاری زبان میں مہارت رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ریاست میں وہاں کی زبان میں تعلیم دینے والے اسکولوں اور کالجوں کی بہتات ہوگئی۔ جن میں داخلہ لینا اردو مادری زبان رکھنے والے طلبہ کی مجبوری بن گئی۔ پہلے سے قائم شدہ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کی گھٹتی ہوئی تعداد کی وجہ سے ان اسکولوں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوتی گئی۔ البتہ کہیں کہیں اردو والوں کی کامیاب نمائندگی کی بدولت ابتدائی سطح پر اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا۔ ریاست جموں وکشمیر جس کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی وہاں اردو میڈیم سے صرف ابتدائی جماعتوں سے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام رہا۔ ماضی میں اردو کے گہوارے کے طور پر شہرت رکھنے والی ریاست اتر پردیش میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واحد درس گاہ ہے جس میں ہائی اسکول تک اردو ذریعۂ تعلیم رائج ہے، جب کہ پوری ریاست میں چند مڈل اسکول ہیں جہاں اردو میڈیم کی جماعتوں کا انتظام ہے۔ کچھ ریاستیں ایسی ہیں جہاں سرکاری اور نجی سطح پر بارھویں جماعت تک اردو میں تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، دہلی اور مغربی بنگال کی ریاستیں شامل ہیں۔ بہار اور کرناٹک میں صرف دسویں جماعت تک اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ راجستھان اور ہریانہ میں چند پرائمری اسکول ہیں جہاں اردو میڈیم جماعتوں کا انتظام ہے۔ گجرات میں صرف احمد آباد میں اردو میڈیم کے دو سیکنڈری اسکول قائم ہیں۔

ہندوستان میں آندھرا پردیش ملک کی واحد ریاست ہے جہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے پہلے چند یونیورسٹیوں کے ملحقہ کالجوں میں اردو میڈیم میں گریجویشن کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ حیدرآباد میں خاصی تعداد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ کالج ہیں جہاں اردو میڈیم میں تعلیم کا انتظام ہے۔ چنانچہ اردو آرٹس ایوننگ کالج میں 1962 سے بی.اے.اور 1971 سے بی.کام کی تعلیم اردو میں دی جارہی ہے۔ 1971 سے ممتاز کالج میں بی ایس سی اور انوار العلوم کالج میں بی.اے اور بی.کام میں اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا جس سے اردو میڈیم کے طلبہ استفادہ کررہے ہیں۔ حسینی علم گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن 1984 سے لڑکیوں کو اردو میں بی.اے اور بی.کام کی تعلیم دے رہا ہے۔ اندراپریہ درشنی گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن میں 1980 سے اور اسلامیہ ڈگری کالج فار ویمن میں 1998 سے بی.اے اور بی.کام کی اردو جماعتوں کا انتظام ہے جن میں خاصی تعداد میں لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ حیدرآباد ہی میں قائم اندراپریہ درشنی گورمنٹ پی جی کالج فار ویمن ملک کا واحد کالج ہے جہاں پر 2001 سے لڑکیوں کے لیے اردو میڈیم میں ایم.اے (اکنامکس) کی تعلیم دی جارہی ہے۔ آندھرا پردیش میں ورنگل کے مقام پر کاکتیہ یونیورسٹی سے ملحقہ اسلامیہ آرٹس اینڈ سائنس کالج 1972 میں قائم ہوا تھا جس میں اردو میڈیم میں بی.اے، بی.ایس اور بی کام کی تعلیم کا انتظام ہے۔ کڑپہ میں گورنمنٹ ڈگری کالج فار مین 1973 میں قائم کیا گیا تھا جس میں اردو میں بی.اے کی جماعتوں کا انتظام ہے۔ اس کالج میں 2003 میں کمپیوٹر ایپلی کیشن کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ یہ کالج تروپتی یونیورسٹی سے الحاق رکھتا ہے۔ اسی یونیورسٹی سے ملحقہ گورنمنٹ ڈگری کالج رائے چوٹی 2002 سے بی.اے کی اردو میڈیم جماعتوں کا انتظام کررہا ہے، جہاں پر کمپیوٹر ایپلی کیشن کو 2005 میں اختیاری مضمون کے طور پر داخل نصاب کیا گیا۔ آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں نندیال کے مقام پر نیشنل ڈگری کالج قائم ہے، جہاں 1982 سے اردو میڈیم میں بی.اے کی تعلیم دی جارہی ہے جس میں تاریخ، سیاسیات اور نظم ونسق عامہ جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد میں قائم کی گئی ملک کی پہلی اوپن یونیورسٹی جو بی.آر.امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے نام سے شہرت رکھتی ہے اس کے تحت فاصلاتی تعلیم میں 1994 سے اردو میں بی.ایس سی کی متوازی جماعتوں کا انتظام ہے۔

اس یونیورسٹی کا دائرۂ کار پوری ریاست آندھرا پردیش ہے جس کے چھوٹے بڑے شہروں میں قائم اسٹڈی سنٹروں پر طلبہ و طالبات کونسلنگ کے لیے جماعتوں میں شریک ہوتے ہیں۔

1998 میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام حیدرآباد میں عمل میں آیا تو گویا اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سارے ملک میں دروازے کھل گئے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک گیارہ سال کے عرصے میں فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو میں بی.اے، بی.کام اور بی.ایس سی کورسیز ترتیب وار 1998، 1999 اور 2000 میں شروع کیے گئے۔ جب کہ پوسٹ گریجویشن میں ایم.اے (اردو) 2004 میں، ایم.اے (تاریخ) 2005 میں اور ایم.اے (انگریزی) 2006 میں شروع کیا گیا۔ ابتدا میں اردو یونیورسٹی کے صرف 18 اسٹڈی سنٹر تھے۔ پچھلے گیارہ سال میں ملک کی 17 ریاستوں میں اسٹڈی سنٹروں کی تعداد 150 تک پہنچ گئی جہاں بی.اے، بی.ایس سی، بی.کام اور ایم.اے میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سعودی عرب کے جدہ میں سال 2007 میں یونیورسٹی کا ایک امتحانی مرکز قائم ہو چکا ہے اور یہاں کے طلبہ پہلے اور دوسرے سال کا امتحان دے چکے ہیں۔ ملک کی ریاستوں میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں پچھلے گیارہ سال کے عرصے میں داخلہ لینے والوں کی تعداد کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ گریجویشن میں سب سے زیادہ طلبہ ریاست مہاراشٹر میں اور پوسٹ گریجویشن میں آندھرا پردیش میں زیر تعلیم ہیں۔ گریجویشن میں دوسرے نمبر پر آندھرا پردیش اور پوسٹ گریجویشن میں جموں و کشمیر کا مقام آتا ہے۔ تیسرے مقام پر گریجویشن میں جموں و کشمیر اور پوسٹ گریجویشن میں مہاراشٹر ہے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے والی ریاست بہار کا مقام گریجویشن میں پانچواں اور پوسٹ گریجویشن میں چوتھا ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ اس نظام سے وہی لوگ استفادہ کرتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے طالب علمی کے زمانے میں تعلیم منقطع کر چکے ہوں اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے فاصلاتی تعلیم کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے داخلہ لینے والوں میں ڈراپ آؤٹس کے علاوہ کثیر تعداد میں وہ نوجوان طلبہ بھی استفادہ کرتے ہیں جو بارھویں جماعت یا اس کے مماثل کوئی امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنے تعلیمی سلسلے کو قائم رکھنے سے اس لیے قاصر رہتے ہیں کہ ان کی ریاست میں اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع نہیں۔ دینی مدارس کے وہ فارغ التحصیل بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے صداقت نامے بارھویں کے مماثل قرار دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اردو یونیورسٹی میں ڈراپ آؤٹس کو اہلیتی امتحان کی کامیابی پر اور بارھویں کامیاب یا اس کے مماثل سرٹیفکیٹ رکھنے والوں کو راست داخلہ ملتا ہے۔ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک گیارہ سال میں اہلیتی امتحان کے ذریعے اور راست داخلہ لینے والوں کے سال واری فیصد کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سال 1998 میں سب سے زیادہ تعداد میں ڈراپ آؤٹس نے داخلہ لیا تھا جو جملہ داخلہ لینے والوں کی تعداد کا 70 فیصد تھا۔ رفتہ رفتہ داخلہ لینے والوں میں ڈراپ آؤٹس کا فیصد گھٹتا گیا اور بارھویں یا اس کے مماثل سرٹیفکیٹ رکھنے والوں کا فیصد بڑھتا گیا۔ چنانچہ 2007 میں ڈراپ آؤٹس کے داخلہ لینے والوں کی تعداد کا فیصد گھٹ کر 23 فیصد رہ گیا جب کہ بارھویں جماعت یا اس کے مماثل کورس کامیاب کرنے والوں کی تعداد کا فیصد 77 ہو گیا۔

کیمپس میں روایتی انداز سے اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے مختصر مدت میں کئی سنگ میل طے کیے ہیں۔ یہاں پوسٹ گریجویشن کے جو بھی کورس شروع کیے گئے ان میں انگریزی کے ایک پرچے کے علاوہ کمپیوٹر اپلی کیشن کا پرچہ داخل نصاب رہا تا کہ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دوسرے میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے ہر مسابقت کر سکیں۔ 2004 میں یہاں ایم.بی.اے کورس شروع کیا گیا جس میں 40 سیٹوں کے لیے انٹرنس امتحان میں کامیابی پر داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کورس میں کمپیوٹر اپلی کیشن کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا ایک پرچہ بھی شامل کیا گیا۔ ابتدا میں طلبہ کو اردو کے اس کورس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اس لیے دو سال میں صرف 37 طلبہ ہی نے داخلہ لیا۔ جب اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے والے 31 پوسٹ گریجویٹ مختلف کمپنیوں میں روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کورس میں داخلہ لینے کے خواہشمندوں کی تعداد بڑھ گئی اور بعد کے سالوں میں پوری 40، 40 سیٹیں پر ہو گئیں اور کئی طلبہ داخلے سے محروم رہے۔ اطلاعات کے مطابق ایم.بی.اے کے چند طلبہ کو کمپنیوں کی طرف سے ملازمت کی پیش کش اس وقت کی گئی جب وہ ابھی چوتھے سمسٹر کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

یونیورسٹی میں ایم.اے، ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم (MCJ) کا کورس بھی 2004 میں شروع ہوا۔ داخلہ کے لیے 20 سیٹیں مختص کی گئیں۔ پچھلے چار سال میں 55 طلبہ نے اس کورس میں داخلہ لیا۔ ابتدائی دو بیچس کے جملہ 23 لڑکے لڑکیوں نے امتحان پاس کیا اور ان میں کئی طلبہ اس وقت اردو اخبارات

اور ٹی وی چینلوں میں برسر کار ہیں۔

انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں ترجمے کے لیے مترجمین کی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے اردو یونیورسٹی نے 2006 میں ایم اے (ٹرانسلیشن) کا کورس شروع کیا۔ جس کے لیے 15 سیٹیں متعین کی گئی ہیں۔ پچھلے دو سال میں اس کورس میں 27 طلبہ داخلہ لے چکے ہیں اور تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کی تعلیم کا 2006 سے انتظام کیا گیا اور دو سال میں 38 گریجویٹس نے اس کورس میں داخلہ لیا اور زیر تعلیم ہیں۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کی نئی زمانہ اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو یونیورسٹی نے ایک سالہ پی جی ڈپلوما ان انفارمیشن ٹکنالوجی کورس 2005 میں شروع کیا اور اب تک 30 گریجویٹس نے اس میں داخلہ لیا ہے۔ جن میں سے 14 طلبہ اس کورس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آنے والے سال ایم ایس سی (انفارمیشن ٹکنالوجی) کا کورس بھی شروع ہونے والا ہے۔ اردو یونیورسٹی نے حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں عصری لیبارٹریز اور ورکشاپس سے لیس ITIs یعنی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھے ہیں۔ حیدرآباد میں الکٹریشن، پلمبنگ، ریفریجریشن اینڈ ایرکنڈیشننگ، الکٹرانک میکانک اور ڈرافٹس مین (سیول) کے ٹریڈس، بنگلور میں ریفریجریشن اینڈ ایرکنڈیشننگ اور الکٹرانک میکانک ٹریڈس اور دربھنگہ میں الکٹریشن اور پلمبنگ کے ٹریڈس کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اور طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ یہ ٹریڈس نیشنل کونسل آف ووکیشنل کورسز آف انڈیا اور یو جی سی کے تسلیم شدہ ہیں۔

انجینئرنگ کے شعبوں میں ملک کو درکار ماہرین کی مانگ کے پیش نظر یونیورسٹی 2008 میں ملک کے تین مقامات حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں پالی ٹیکنک کالجوں کا قیام عمل میں لاچکی ہے۔ اس تین سالہ کورس کے لیے صرف میٹرک کامیاب طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں چار کورسز سیول انجینئرنگ، کمپیوٹر انجینئرنگ، الکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اردو مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے نہ صرف یونیورسٹی کیمپس میں بی ایڈ کالج قائم کیا بلکہ سری نگر، بھوپال اور دربھنگہ میں بھی کالج قائم کیے گئے جہاں ایک سالہ بی ایڈ کورس میں داخلوں کے لیے 100,100 سیٹوں کا انتظام ہے۔ انٹرنس امتحان کی بنیاد پر ان کالجوں میں اردو یونیورسٹی کے گریجویٹس کو بھی ٹریننگ کے لیے داخلہ ملا۔ دو سال کے عرصے میں کیمپس کالج میں 181 اور سری نگر کالج میں 145 طلبہ نے کورس کی تکمیل کی جن میں سے بیشتر مختلف ریاستوں میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اردو یونیورسٹی کیمپس میں سال 2007 میں ایم ایڈ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس کورس میں بی ایڈ کامیاب 25 امیدواروں کو انٹرنس امتحان کی بنیاد پر داخلہ دیا گیا جن میں 21 طلبہ ایسے تھے جنھوں نے اردو یونیورسٹی ہی سے بی ایڈ کی تکمیل کی تھی۔ سال 2008 سے یہاں ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کے لیے بھی داخلے دیے جا رہے ہیں۔

اردو یونیورسٹی نے 2006 میں اردو میڈیم ہائی اسکولوں کو تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کے لیے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) کے ساتھ مل کر فاصلاتی طرز پر دو سالہ بی ایڈ کورس کا ایک مشترکہ ڈگری پروگرام شروع کیا تھا۔ یہ کورس یونیورسٹی کیمپس حیدرآباد، سکندرآباد، کرنول، بنگلور، اورنگ آباد، بھوپال، لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ میں دس بی ایڈ کالجوں میں شروع کیا گیا۔ ہر کالج میں 100 سیٹوں کے لحاظ سے ایک ہزار ایسے غیر تربیت یافتہ زیر ملازمت ٹیچروں کو داخلہ دیا گیا جو کسی بھی ریاستی حکومت کے منظور شدہ اسکول میں دو سال کا تدریسی تجربہ رکھتے تھے۔ منتخب کردہ امیدواروں میں 98 ٹیچر ایسے تھے جنھوں نے اردو یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی تھی۔ کامیابی حاصل کرنے والے ٹرینڈ گریجویٹ نے یا تو ملازمت میں ترقی پائی انھیں ہائی اسکولوں میں ملازمت ملی۔ 2008 میں یونیورسٹی نے اگنو کے ساتھ جوائنٹ ڈگری پروگرام کو ختم کرتے ہوئے فاصلاتی طرز پر اپنا ہی بی ایڈ کورس سات شہروں حیدرآباد، سکندرآباد، بنگلور، پونے، دربھنگہ، جموں اور سری نگر کے کالجوں میں شروع کیا۔

آندھرا پردیش میں عثمانیہ کالج آف ایجوکیشن کرنول جو نومبر 1993 میں قائم کیا گیا تھا اور جو کرشنا دیورائے یونیورسٹی سے الحاق رکھتا ہے، اس میں 50 سیٹوں کی حد تک داخلے دیے جاتے ہیں اور مکمل تعلیم اردو میڈیم میں ہوتی ہے۔ اسی ریاست میں گنٹور سے قریب ایک مقام پر بسوا تارک راما کالج آف ایجوکیشن کا قیام 1994 میں عمل میں آیا جس میں 100 سیٹوں کے لیے داخلہ دیا جاتا ہے اور بی ایڈ کی تعلیم اردو میڈیم میں دی جاتی ہے۔ گنٹور ہی سے قریب ایک بی ایڈ کالج جس کا نام HMKS & MGSM کالج آف ایجوکیشن ہے 2001 سے انگریزی میڈیم میں تعلیم دے رہا ہے۔ اس کالج میں 2007 سے 50 طلبہ کے لیے اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے متعلقہ او رملحقہ بی ایڈ اور ایم ایڈ کالجوں میں تعلیم تو انگریزی میڈیم میں دی جاتی ہے لیکن طلبہ کو اس بات کی آزادی رہتی ہے کہ وہ چاہیں تو جوابات اردو میں لکھیں۔ مہاراشٹر میں مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر نگرانی چلائے جانے والے مرہٹواڑہ کالج آف ایجوکیشن، اورنگ آباد میں 2005 سے 150 طلبہ کو بی ایڈ کی تعلیم اردو اور انگریزی دونوں زبانوں

میں دی جارہی ہے۔ اس طرح پچھلے تین سال میں یہاں سے 450 طلبہ نے بی.ایڈ کی ٹریننگ حاصل کی اور سرکاری غیر سرکاری اسکولوں میں ملازمت حاصل کی۔ اورنگ آباد میں B.Ed کی تعلیم کے لیے دو اور کالج DSR کالج آف ایجوکیشن اور تنزیل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن قائم ہیں جن میں تعلیم تو انگریزی میں دی جاتی ہے لیکن طلبہ اردو میں جواب لکھ سکتے ہیں۔ ویسے مہاراشٹرا کے کسی بھی بی.ایڈ کالج میں زیر تعلیم انگریزی میڈیم کے طلبہ کو اردو میں سوالوں کے جواب لکھنے کی اجازت ہے۔ خلد آباد (مہاراشٹرا) میں حضرت پیر محمد کالج آف ایجوکیشن 2004 سے تعلیم و تربیت میں مصروف ہے جس میں بی.ایڈ اردو میڈیم کے لیے 50 سیٹیں مختص ہیں۔ ٹیچرس ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں بی.ایڈ کے لیے 200 سیٹوں پر داخلہ دیا جاتا ہے جس میں 100 سیٹیں اردو میڈیم کے لیے مختص ہیں۔ اسی طرح یہاں ڈپلوما ان ایجوکیشن میں بھی جملہ 100 سیٹوں میں سے 50 سیٹیں اردو میڈیم کے لیے محفوظ رہتی ہیں۔ یہاں کے طلبہ کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انھیں امتحان میں پرچے انگریزی، ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں دستیاب رہتے ہیں۔

اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلا مسئلہ درسی کتابوں کا ہے جن کی فراہمی ایک دشوار امر ہے۔ مضامین چاہے وہ قدیم ہوں کہ جدید، ملک میں اردو میں لکھنے والوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مضامین کے ماہرین جو یہ کام کر سکتے ہیں وہ یا تو اتنے مصروف رہتے ہیں کہ اردو میں لکھنے کے لیے یا انگریزی سے ترجمہ کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں دے پاتے یا پھر بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے یہ کام کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ترجمے کے لیے اکثر ایسے لوگ آگے آتے ہیں جو نہ اپنے مضمون میں مہارت رکھتے ہیں اور نہ دونوں زبانوں پر قدرت۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ معیاری تراجم کروائے جاسکیں۔ جدید علوم میں ترجمے کے ساتھ اصطلاحوں کا بھی ایک مسئلہ رہتا ہے۔ پہلے تو اصطلاحیں دستیاب نہیں ہوتیں اور اگر دستیاب بھی رہتی ہیں تو شمال میں کچھ اصطلاحیں مروجہ ہیں تو جنوب میں کچھ اور۔ ان میں یکسانیت برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے میں ترجمہ شدہ اچھی کتابوں کی طلبہ کو فراہمی دشوار ہوجاتی ہے۔ اکثر مضامین کے لیے اردو میڈیم میں پڑھانے والے تعلیم یافتہ اساتذہ کی بھی قلت کا سامنا رہتا ہے۔ اس طرح مختلف مضامین کے لیے اردو میڈیم میں مؤثر تعلیم کا انتظام بے حد مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ مسائل تب ہی حل ہوں گے جب اردو میڈیم میں پڑھنے والے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خود ہی اس قابل ہوجائیں کہ وہ مختلف مضامین پڑھا سکیں، ترجمہ کر سکیں اور کتابیں لکھ سکیں۔

اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے موجودہ منظرنامے کے پیش نظر مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر یہ سب کچھ کر دکھائیں گے اور اردو زبان ملک میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی۔

□□□

پتہ:
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032, A.P.

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فیروز احمد

راجستھانی بولی/ زبان

ہندی زبان وادب کے بیشتر علما نے جن زبانوں/ بولیوں کو" ہندی" کے دائرے میں شامل کیا ہے ان میں ایک راجستھانی بھی ہے۔ اس سے مراد عموی طور پر وہ زبان ہے جو راجستھان میں بولی جاتی ہے۔ لیکن اصلاً راجستھانی کسی ایک بولی یا زبان کا نام نہیں، بلکہ یہ مجموعہ ہے کم از کم پانچ الگ الگ مزاج رکھنے والی بولیوں کا جو راجستھان کے مختلف علاقوں میں صدیوں سے بول چال کا ذریعہ ہی ہیں۔ جان بیمز (John Beams) نے ان مختلف بولیوں کو اپنی کتاب An out time of Indian Philology میں راجپوتی بولیاں یا راجستھانی بولیاں کہا ہے۔

راجپوتی یا راجستھانی دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ آزادی سے قبل راجستھان ہی راجپوتانہ تھا۔ یہ نام انگریزوں کا دیا ہوا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ ہندوستان کے اس علاقے میں بیشتر راجپوت قومیں آباد تھیں اور سرزمین راجستھان کا بڑا حصہ انھی راجپوت قوموں کے زیر اقتدار تھا۔ انگریزوں نے گوڈوانہ اور تلنگانہ کے طرز پر راجپوت آبادی پر مشتمل ہندوستان کے اس علاقے کا نام راجپوتانہ رکھ دیا۔ آزادی کے بعد یہی راجپوتانہ راجستھان کے نام سے موسوم ہوا۔[1]

ابھی کہا گیا ہے کہ راجستھان میں بولی جانے والی زبان راجستھانی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ راجستھانی مختلف بولیوں کی ایسی شکل ہے جو اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے مختلف ہیں، مگر ان کی اصل ایک ہے اور یہ راجستھان کے وسیع وعریض علاقوں میں موجودہ ہندی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باوجود بول چال میں مستعمل ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندی یا اردو کے جنم سے بہت پہلے راجستھانی موجود تھی اور نہ صرف راجپوتانہ بلکہ اس کے جغرافیائی حدود سے متصل دوسرے صوبوں تک اس کے اثرات موجود تھے[2] خود راجستھانی بھی دوسری علاقائی زبانوں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ راجستھان آزادی سے قبل چھوٹی بڑی مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ اودے پور، ڈونگر پور، بانسواڑہ اور پرتاپ گڈھ سسودیوں کے، جودھپور، بیکانیر اور کشن گڈھ راٹھوروں کے، جے پور اور الور کچھواہوں کے، بوندی، کوٹا اور سروہی چوہانوں کے جبکہ جیسلمیر اور قرولی یادوں کے قبضۂ اختیار میں تھے۔ یہ تمام ہندو ریاستیں تھیں جبکہ ریاست ٹونک راجستھان کی واحد مسلم ریاست تھی اور اس کی قلم رو میں ایسے پرگنے بھی تھے جو جغرافیائی اعتبار سے مدھیہ پردیش کی سرحدوں میں واقع تھے، مگر انگریزوں نے مصلحتاً انھیں ریاست ٹونک کا حصہ بنا دیا تھا۔ ان ریاستوں کے علاوہ چند چھوٹی ریاستیں اور ٹھکانے بھی تھے، جو لسانی نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا ریاستوں میں بولی جانے والی زبانوں کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان کی تفصیل سے قطع نظر بنیادی سوال یہ ہے کہ ان ریاستوں میں کون کون سی راجستھانی بولیاں رائج تھیں اور وہ کس طرح ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہیں؟ گوری شنکر اوجھا نے ان بولیوں کی علاقائی تقسیم درج ذیل انداز میں کی ہے:

1. **مارواڑی:** جو مارواڑ، جودھپور، جیسلمیر، بیکانیر، اور شیخاواٹی کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اس پورے علاقے کو مجموعی طور پر مرودیش بھی کہا جاتا ہے، اور یہاں کی زبان کو مرو بھاشا۔ ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری کے مطابق تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہی مرو بھاشا پورے راجستھان کی ادبی زبان تھی۔
2. **میواڑی:** میواڑ یعنی اودے پور اور اس کے قرب وجوار میں بولی جانے والی زبان۔
3. **باگڑ/ باگڑی:** ڈونگر پور، بانسواڑہ، میواڑ کے جنوبی علاقوں اور سروہی کے مغرب میں بولی جانے والی زبان۔ اس زبان کا گہرا رشتہ گجرات کی زبان گجری/ گجراتی سے بھی ہے۔
4. **ڈھونڈھاری:** ریاست جے پور کے اطراف کی زبان
5. **ہاڑوتی:** ریاست بوندی، کوٹہ، شاہ پورہ، اور میواڑ کے مشرقی حصوں کی زبان
6. **میواتی:** الور کے میواتی علاقوں کی زبان جس پر پنجابی، ہریانی اور برج کے بھی اثرات ہیں۔ حکیم اجمل خاں نے اپنے مضمون "میواتی بولی" میں علاقۂ میوات کی اس بولی کو "قدیم آریائی بولی" قرار دیتے ہوئے اسے ڈنگل کی ایک شاخ کہا ہے[3] جو لسانی اعتبار سے درست نہیں ہے۔
7. **برج بھاشا:** لسانی اعتبار سے یہ راجستھانی سے مختلف ہے مگر اس کے گہرے اثرات الور کے مشرق، بھرتپور، دھولپور اور قرولی کے اطراف میں نظر آتے ہیں۔[4]

راجستھان میں بولی جانے والی مختلف بولیوں کی یہ تقسیم علاقائی اعتبار سے کی گئی ہے۔ یہ تمام بولیاں عموماً آج بھی رائج ہیں اور یہاں کی آبادی کا قابل لحاظ حصہ ان بولیوں کا استعمال اپنی روزمرہ کی زندگی میں کرتا ہے۔ لیکن کیا راجستھان کی ان علاقائی بولیوں میں ادب بھی تخلیق کیا گیا ہے؟ اس سوال

کا جواب کسی قدر نفی میں ہے۔ راجستھانی زبان و ادب کے تمام ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ راجستھان میں تخلیق کی زبانیں اصل میں صرف دو ہیں۔ ان دونوں زبانوں کو عام طور پر ڈنگل[5]، اور پنگل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انھیں دو زبانوں میں عہد قدیم سے لے کر راجستھان کی تشکیل نو تک جو ادب تخلیق ہوا، اسے راجستھانی ادب ہی کہا گیا ہے، خواہ اس ادب کی تخلیق ان علاقوں میں ہی ہوئی ہو جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا۔ جارج گریرسن نے اپنے لسانی جائزۂ ہند میں راجستھانی کو اندرونی دائرے کی زبانوں کے وسطی گروہ میں شامل کیا ہے اور مغربی ہندی سے اس کے خصوصی تعلق کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح مغربی ہندی یعنی برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، کھڑی بولی اور ہریانی سے راجستھانی کا گہرا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ یہ رشتہ ماں اور بیٹی کا نہیں بلکہ دو بہنوں کا آپسی رشتہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جس طرح مغربی ہندی کی بولیوں کا ماخذ کسی اور زبان میں ہے اسی طرح راجستھانی بھی اپنی اصل کے اعتبار سے اسی زبان سے متعلق ہے جس سے مغربی ہندی۔ یہ زبان شورسینی اپ بھرنش ہے جو ہندوستان کی جدید زبانوں کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اگر چہ شوکت سبزواری اور گیان چند جین شورسینی پراکرت کو اردو کی تشکیل میں اہمیت نہیں دیتے لیکن اس پراکرت نے راجستھانی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ اس پراکرت سے پہلے راجستھان کا لسانی پس منظر کیا تھا اور یہاں کون سی زبان رائج تھی۔

ڈاکٹر موتی لال مینار یا کا خیال ہے کہ راجستھان میں پراکرتوں کے ظہور سے قبل جو زبان رائج تھی وہ سنسکرت ہے، عہد اشوک کے جو کتبات راجستھان کے مختلف حصوں سے برآمد ہوئے ہیں ان کی زبان سنسکرت ہی ہے۔[6]

یہی سنسکرت عالمانہ اظہار خیال کا ذریعہ تھی، لیکن جس طرح سنسکرت کے بطن سے پراکرت پیدا ہوئی اور ملک کے الگ الگ حصوں میں مختلف ناموں سے جانی گئی، اسی طرح راجستھان میں بھی عوام کی زبان پراکرت تھی۔ اس پراکرت کو ناگر روپ کا نام دیا گیا ہے۔ ان پراکرتوں کو بھی سنسکرت کی طرح جب قواعد میں جکڑ دیا گیا تو بول چال میں اپ بھرنش کا ظہور ہوا۔ پراکرت کی طرح یہ اپ بھرنش بھی کسی قاعدے کلیہ سے بے نیاز تھی۔ راجستھان میں عہد قدیم کا تمام ترجینی ادب اسی اپ بھرنش میں ہے، جس کی تاویل ڈاکٹر مہیشوری نے راجستھانی کے ''سنت اسلوب'' سے کی ہے۔

ایسا مانا گیا ہے کہ راجستھان میں عام طور پر اپ بھرنش کا بول بالا چھٹی سے لے کر تیرھویں صدی تک رہا۔ اس مدت میں تخلیق شدہ ادب بیشتر جین مذہب سے متعلق ہے اور راجستھانی زبان و ادب کے ماہرین اسے لسانی اعتبار سے بہت اہم گردانتے ہیں۔ لیکن جب اس اپ بھرنش کے اثرات کم ہونے لگے تو عوام میں رائج اس کی وہ صورت نمودار ہوئی جسے ''ڈنگل'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ڈاکٹر مینار یا نے لکھا ہے کہ جب اپ بھرنش کے بھی دو روپ ہوگئے تو اس کا ایک روپ جو عوام میں مقبول ہو رہا تھا وہ اپ بھرنش کے پہلے قواعدی روپ کے مقابلے میں زیادہ نکھرتا گیا اور کم از کم تین شکلوں میں ظاہر ہوا جنھیں اپ بھرنش کا ناگر، اُپ ناگر اور براچڑ روپ کہتے ہیں[7] ان میں اپ بھرنش کے ناگر روپ سے راجستھانی کا جنم ہوا جو اپنی اصل کے اعتبار سے شورسینی اپ بھرنش ہی تھی۔ اس اپ بھرنش کے بعض دوسرے نام بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ان میں گرجری اپ بھرنش اور شورسینی اپ بھرنش خاص طور پر اہم ہیں۔ اول الذکر سے راجستھانی اور ثانی الذکر سے موجودہ ہندی زبان وجود میں آئی۔ یوں راجستھانی اور ہندی اپنی سرشت اور مزاج کے اعتبار سے دو الگ الگ زبانیں قرار پاتی ہیں۔ (دیکھیے راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ ص 34) ڈنگل اسی راجستھانی کا قدیم ادبی روپ ہے۔

ڈنگل کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اور راجستھانی زبان کو یہ نام کب ملا، اس سلسلے میں ماہرین لسانیات میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر ایل پی تیسی توری، ڈاکٹر ہری پرشاد شاستری، گج راج اوجھا اور ایشور پرشاد نے ڈنگل لفظ کے بارے میں الگ الگ رائیں ظاہر کی ہیں[8] خود ڈاکٹر مینار یا کے نزدیک چونکہ ڈنگل اپنے ابتدائی دور میں ہی نہیں بلکہ صدیوں تک عموماً چارن بھاٹوں کی زبان تھی جو اپنے سرپرستوں سے بھری ہوئی) کہلائی[9] بعد ازاں روزمرہ میں ڈینگل لفظ ڈنگل میں تبدیل ہوگیا۔

ڈنگل کی طرح لفظ پنگل بھی معنوی اعتبار سے مختلف فیہ ہے، تاہم اس بات پر راجستھانی زبان و ادب کے ماہرین کا اتفاق ہے کہ برج بھاشا کے اثرات کی حامل راجستھانی زبان پنگل ہے۔ ڈنگل کے مشہور ادیب اور ماہر زبان پنڈت رام کرن آسوپا کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے کہ ڈنگل کے وزن پر ہی عوام نے پنگل کا لفظ گڑھ لیا ہے۔

ڈنگل قدیم ہے اور پنگل نسبتاً اس کے بعد اپنا وہ رنگ روپ اختیار کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ راجستھان کی عام بول چال کی زبان بنی۔ چونکہ پنگل اپنے لب و لہجے اور صوتی آہنگ کے سبب ڈنگل سے مختلف رہی اور رجزیہ مضامین کے علاوہ اس میں عشق و بھکتی کے جذبات بھی نظم ہوتے تھے، اس لیے پنگل عوام الناس میں زیادہ مقبول ہوئی۔ ڈاکٹر مینار یا نے ڈنگل کی مثال پرتھوی راج کی مشہور تصنیف ''ویلی کسن رُکمنی ری'' (वेली किसन रुकमणीरी) سے دی ہے اور اس کی لفظیات نیز تلفظ کے اعتبار سے اسے پنگل سے بالکل مختلف زبان قرار دیا ہے۔

ایسا ہی خیال ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری کا بھی ہے۔ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ پنگل اور ڈنگل دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ مزید یہ کہ پنگل کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے اور ڈنگل کا گرجری اپ بھرنش سے ہوا[10] ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری کے لفظوں میں یہی مرو بھاشا یا ڈنگل اپنے ابتدائی دور میں

گجراتی سے مماثل تھی، اس طرح گجراتی اور راجستھانی (ڈنگل) میں قریبی رشتہ رہا ہے۔

ڈاکٹر مہیشوری کا یہ بھی خیال ہے کہ مرو بھاشا کے لیے ہی ڈنگل کا استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے کہ عہد قدیم (یعنی چھٹی صدی سے تیرھویں صدی) میں یہی ڈنگل راجستھان کے مختلف اضلاع کے عوام کی بول چال کی زبان تھی۔

محمود شیرانی نے دہلی کی قدیم زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج"(11) راجستھانی کے دور رس اثرات کے سلسلے میں مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ "مسلمانوں کے فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں زبان کا جو کینڈا تھا وہ نہ برج بھاشا ہے اور نہ کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔"(12)

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مسعود حسین خاں جس قدیم اپ بھرنش کا ذکر کرتے ہیں، وہ شورسینی اپ بھرنش ہے، جس نے راجستھانی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ یہ شورسینی بھی آگے چل کر متعدد شاخوں میں تقسیم ہوگئی۔ چنانچہ اس کی ناگر شاخ کو راجستھانی زبان کا اصل ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل چونکہ شمالی ہند اور بالخصوص دہلی اور اس کے اطراف میں لاہور تک راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا، جن کی زبان راجستھانی تھی، اس لیے محمود شیرانی اور مسعود حسین خاں کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ہندی کی ذیلی بولیوں اور راجپوتوں کی زبان کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی لسانی تشکیل میں راجستھانی کے کردار کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اسی نقطۂ نظر سے لکھا ہے:

"اردو دوآبے کی زبان ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ آس پاس کی تمام زبانوں سے اس نے فیض اٹھایا ہے، ان میں پنجابی بھی ہے اور راجستھانی اور گجراتی بھی، ایک لحاظ سے یہ زبانیں اردو کے مختلف روپ ہیں۔"(13)

مارواڑی جسے مرو بھاشا بھی کہتے ہیں راجستھان کی قدیم زبان ہے۔ اسی قدیم زبان کی تاویل ڈنگل سے کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ٹیسوری نے ڈنگل کی لسانی خصوصیات کے ضمن میں اَئی (अइ) کے طویل اَے (ऐ) میں اور اَو (अउ) کے طویل اَو (औ) کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر مہیشوری نے ٹیسوری کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پندرھویں صدی عیسوی کی منظوم تصنیف अचल दास खीची री वचनिका کا لسانی تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ ٹیسوری نے قدیم ڈنگل کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس میں اَئی اور اَے کے علاوہ اَو اور اَو دونوں کی مثالیں ملتی ہیں۔(14)

مارواڑی کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (ण) کا استعمال بہت ہے۔ مثلاً پانی کو پاڑیں، کانا کو کاڑاں وغیرہ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ایسی مثالیں مؤلف نوراللغات کے مطابق دہلی کی زبان میں بھی ملتی ہیں جیسے کانڑا، کانڑی رانڑ، رانڈ۔ میرابائی کے پدوں میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ اگرچہ میرا کی شاعری اور اس کی لفظیات پر برج کا بھی گہرا اثر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈنگل کے مقابلے میں پنگل کے اثرات، جو برج سے خاصی متاثر رہی، میرابائی نے قبول کیے ہیں۔ غالباً اسی خیال سے پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے کہ "اپ بھرنش عہد میں راجستھانی کا بھی ادبی روپ تھا جو ڈنگل کہلاتی ہے۔"(15)

حواشی:

1. راجپوتانے کا اتہاس (جلد اول) ص-1 گوری شنکر ہیرا چند اوجھا
2. جان گریرسن نے تو مالوہ تک راجستھانی کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے Linguistic survery of india vol-1. p.171
3. ماہنامہ آج کل جون 1979 ص-42
4. بحوالہ راجپوتانہ کا اتہاس (جلد اول) ص-24، مختلف علاقوں کی ان بولیوں کے پیش نظر ہی گریرسن راجستھانی کو وسیع تر علاقے کی زبان قرار دیتا ہے۔ Laigiustic Survery of India, By G A Grierson Vol.I, part (1) p-171
5. ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری اسے ڈنگل اسلوب کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں راجستھانی کے چار اسلوب ہیں، (1) ڈنگل اسلوب (2) جین اسلوب (3) سنت اسلوب (4) عوامی اسلوب دیکھیے، راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ (ہندی) ص 5-6 مطبوعہ کلکتہ 1960
6. راجستھان کا پنگل ساہتیہ (ہندی) ص 5 مطبوعہ جودھپور 2006
7. ڈنگل میں ویررس (ہندی) ص 1 مطبوعہ جودھپور 2000
8. دیکھیے ڈنگل میں ویررس (ہندی) ص 10 تا 15
9. دیکھیے ڈنگل میں ویررس ص 15، ایل پی ٹیسوری (LPTessitory) لکھتے ہیں۔
"In the magniloguent strains of Charan every thing takes a gignatic form, as if he was seeing the world through a magnifying glass, every skirmish becomes a Mahabharata, every little hamlet a lanka every warrior a giant who with his arms upholds the sky."
بحوالہ ایضاً ص-15
10. راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ ص-7
11. پنجاب میں اردو ص 3 مطبوعہ لاہور 1939
12. مقدمہ تاریخ زبان اردو ص-55
13. داستان زبان اردو ص 135 مطبوعہ کراچی 1960
14. راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ ص 18 تا 20
15. ہندی ادب کی تاریخ ص 43 مطبوعہ دہلی-2001

□□□

پتہ:
D-109, Shanti Nagar, Opo. NBC Road,
Jaipur-302006 (Raj.)

غازی علم الدین

اردو میں مستعمل عربی الفاظ

لفظ جب ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف سفر اختیار کرتا ہے تو جہاں اس کی ساخت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، وہاں معانی میں بھی تنوع پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی حال اردو میں مستعمل عربی کے ان الفاظ وتراکیب کا ہے جو جزوی تبدیلی سے ایک سے زائد معانی دیتے ہیں اور اردو کے دامن کو کشادہ کرتے ہیں۔ زیرِنظر مقالے میں اس حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ الفاظ عربی زبان میں اپنی اصل شکل کے ساتھ کس طرح ہیں اور اردو میں شامل ہوکر اپنی ساخت اور معانی کیسے بدلتے ہیں۔

قافلۂ اردو میں شامل ہونے والے عربی کے کئی مصادر اور اسما ایسے ہیں جو لفظی طور پر یا جنس کے اعتبار سے مؤنث ہیں۔ عربی رسم الخط میں ان اسما کے آخر میں ''تا'' آتی ہے۔ زیرِ بحث مسئلے کو سمجھنے کے لیے ''تا'' کی مختلف اقسام کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ذیل میں ''تا'' کی عمومی قسموں کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے۔

تائے تانیث: یہ ''تا'' اسم کی جنس (تانیث) ظاہر کرنے کے لیے اس کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ اس کی دو ذیلی قسمیں ہیں۔

1. تائے مدوّرہ: جسے اردو میں گول تا (ۃ) کہا جاتا ہے۔ یہ واحد مؤنث اسم کے لیے آتی ہے۔ وہ مؤنث اسما جن کے آخر میں ایسا حرف ہجا آجائے، جس کے ساتھ آخر میں کوئی دوسرا حرف ملا کر نہیں لکھا جاسکتا، ان کے آخر میں گول تا (ۃ) آتی ہے جیسے سیّدۃ، شجرۃ، صورۃ، سیارۃ، وردۃ، لذیذۃ، مفیدۃ، بقرۃ، جدۃ، کبیرۃ، صغیرۃ، زاہدۃ، کافرۃ، مسافرۃ، بقرۃ، جدۃ، والدۃ وغیرہ۔

وہ مؤنث اسما جن کے آخر میں آنے والے حرف ہجا کے ساتھ کوئی دوسرا حرف مل سکتا ہے، ان کے ساتھ گول تا کو ملا کر لکھا جاتا ہے جیسے رحمۃ، فاسقۃ، مؤمنۃ، صالحۃ، معلمۃ، ورقۃ، حدیقۃ، مدرسۃ، لیلۃ، معاملۃ، حسنۃ، ساعۃ، ذکیۃ، قویۃ، مفتوحۃ، واسعۃ، عالیۃ، جمیلۃ، طریقۃ، سنۃ، مکتبۃ، نظیفۃ، شمیۃ، خادمۃ، خدیجۃ، عائشۃ، فاطمۃ

2. تائے جمع سالم مؤنث: یہ ''تا'' پوری شکل میں (ت) جمع مؤنث اسما کے آخر میں آتی ہے جیسے صالحات، عاقلات، مسلمات، کافرات، جاہلات، مسافرات، سنوات، مدرّسات، امہات، کاتبات وغیرہ۔

تائے اصلیہ: یہ ''تا'' مفرد الفاظ کے آخر میں آتی ہے اور پوری شکل میں لکھی جاتی ہے جیسے وقت، سمت، صوت، موت، طاغوت، لاہوت، ناسوت، جبروت، ذات، میقات، لات ومنات وغیرہ۔

تائے مصدری: یہ ''تا'' مصدر کے آخر پر گول شکل میں (ۃ) آتی ہے۔ یہ مصدر جب عربی سے اردو میں آتے ہیں تو یہ گول (ۃ) کبھی تائے قرشت میں بدل جاتی ہے جیسے مخالفۃ سے مخالفت، اور کبھی ہائے ہوز میں بدل جاتی ہے۔ جیسے مصافحۃ سے مصافحہ۔ مزید مثالیں ملاحظہ کیجیے مخالفۃ، مشابہۃ، موازنۃ، معانقۃ، موافقۃ، مراسلۃ، معالجۃ، مطابقۃ، مخاصمۃ وغیرہ۔

تائے مبالغہ: یہ ''تا'' عام طور پر مؤنث اسموں کی بجائے مذکر اسمائے مبالغہ کے آخر میں آتی ہے جیسے علامۃ، فہامۃ، قطامہ وغیرہ

تائے فعل ماضی: فعل ماضی کے صیغوں کی کچھ علامتیں حرف ''تا'' سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ ''تا'' پوری شکل (ت) میں لکھی جاتی ہے اور زیر، زبر، پیش اور جزم کے ساتھ فعل ماضی کے مختلف معانی دیتی ہے جیسے کَتَبَتْ (اس مؤنث نے لکھا) کَتَبْتَ (تو مذکر نے لکھا) کَتَبْتِ (تو مؤنث نے لکھا) کَتَبْتُ (میں نے لکھا)

تائے قرشت: یہ پوری شکل کی ''تا'' ہے، جسے ''تائے سالمہ''، ''تائے فوقانیہ'' اور ''تائے مثنات'' بھی کہا جاتا ہے۔ ''تائے سالمہ'' (سالم سے) کا معنیٰ ہے پوری اور مکمل ''ت''،

''تائے فوقانیہ'' (فوق سے) کا معنیٰ ہے وہ تا جس کے اوپر نقطے ہوں۔ اس سے بھی پوری اور مکمل ''ت'' مراد ہے۔

''تائے مثنات'' (مثنیٰ سے) کا معنیٰ دو نقطوں والی ''ت'' ہے۔ الغرض یہ چاروں نام یعنی ''تائے قرشت''، ''تائے سالمہ''، ''تائے فوقانیہ'' اور ''تائے مثنات'' ایک ہی ''ت'' کے مختلف نام ہیں جسے عام طور پر ''تائے قرشت'' کہا جاتا ہے۔

ابن ندیم مصنف ''الفہرست'' کا بیان ہے کہ عربی رسم الخط کی بنیاد رکھنے والا ایک گروہ تھا جس کے ارکان کے نام ابجد، ہوّز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ وغیرہ تھے۔ حروف الہجا کی عددی قیمت کے لحاظ سے گروپ بندی انھی سے منسوب ہے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ لوگ شاہانِ مدین سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے میں یوم الظلّہ میں ہلاک ہوئے۔ انھی لوگوں نے عربی انداز کتابت وضع کیا۔ اس روایت کے بیان کے بعد ابن ندیم نے ''واللہ اعلم'' کہہ کر اہل تحقیق کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق ترتیب ابجدی کے پہلے چھ کلمے دیوؤں کے نام ہیں۔ ایک تیسری روایت کے مطابق ان کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ وہ ہفتے کے دنوں کے نام ہیں، تاہم روشن خیال علمائے صرف ونحو المبرّد اور السیرافی ان

اسطوری توجیہات سے مطمئن نہیں تھے۔

تائے مدورہ کے تائے قرشت اور ہائے ہوز میں تبدیلی: تائے تانیث، تائے مصدری اور تائے مبالغہ جب اسما کے آخر میں آتی ہیں تو عام طور پر تلفظ سے گر جاتی ہیں اور بولنے میں ہائے ہوز (ہ) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسے اکثر اسما جو عربی میں تائے تانیث کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، اردو میں تائے قرشت کے ساتھ لکھنے میں ایک معنی جب کہ ہائے ہوز (ہ) کے ساتھ لکھنے میں دوسرے معنی دیتے ہیں جیسے عربی میں لفظ ارادۃ ہے۔ اسی ایک لفظ سے اردو میں تائے قرشت کے ساتھ ایک لفظ بنتا ہے یعنی ارادت (بمعنی عقیدت) اور ہائے ہوز کے ساتھ دوسرا لفظ بنتا ہے یعنی ارادہ (بمعنی مرضی ومنشا)

ذیل میں اس قسم کی مثالیں بالتفصیل ملاحظہ کیجیے۔ پہلے عربی کا لفظ آئے گا، پھر بالترتیب اوپر سے نیچے تائے مدورہ سے تائے قرشت اور ہائے ہوز میں تبدیل ہونے والے الفاظ اپنے ممکنہ معانی کے ساتھ آئیں گے۔

اتفاقیۃ

اتفاقیت: یگانگت ہونا۔ ہم خیال ہونا

اتفاقیہ: غیر ارادی۔ اچانک۔ غیر متوقع

اجازۃ

اجازت: منظوری۔ رخصت

اجازہ: مرشد سے مرید کرنے کی سند۔ استاد سے فن حاصل کرنے کے بعد اس کو عمل میں لانے کی سند

ادارۃ

ادارت: ایڈیٹری۔ جریدہ نگاری۔ مدیر کا منصب یا کام

ادارہ: دفتر۔ محکمہ۔ کسی تنظیم کا مرکز

(Institution, Establishment, Administration, Organisation)

ارادۃ

ارادت: عقیدت۔ اعتقاد، دلی لگاؤ۔ مریدانہ اطاعت

ارادہ: عزم۔ قصد۔ منصوبہ۔ مرضی۔ خواہش۔ نیت،

اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ
جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ

اشارۃ

اشارت: ایما۔ رمز۔ کنایہ

وہ چلے جاتے ہیں لیکن میں بتا سکتا نہیں
ضعف سے جنبش نہیں بہر اشارت ہاتھ میں

اشارہ: جسم کے کسی عضو کی حرکت سے کوئی بات کہنا۔ کسی بات یا چیز کی طرف اختصار سے توجہ دلانا۔

اشاریۃ

اشاریت: ایک عمومی ادبی اصطلاح (Symbolism)۔ واضح الفاظ یا اشکال کی بجائے علامت کے ذریعے رمزیہ پیرایۂ اظہار

اشاریہ: حوالے کی آسانی کے لیے حروف تہجی کے اعتبار سے کسی کتاب کے مضامین کی تفصیلی فہرست۔ کتاب میں کوئی مضمون، موضوع یا نام ایک سے زیادہ مقام پر آئے تو تمام متعلقہ صفحات کے نمبر ایک ہی عنوان کے تحت دے دیے جاتے ہیں۔ (Index)

اضافۃ

اضافت: ایک کلمہ کا دوسرے کلمے سے تعلق۔ ایک کلمہ کو دوسرے کلمے کی طرف مضاف کرنا۔ دو چیزوں کا باہمی تعلق۔ نسبت

اضافہ: بیشی۔ مقدار یا تعداد میں افزونی۔ افزائش

افادۃ

افادت: فائدہ پہنچانا

حل ہوتے ہیں عقدے علما وفضلا کے
ہر بات ہے تعلیم و افادت کی برابر

افادہ: فائدہ۔ نفع

ع دوست دشمن مجھ کو دونوں سے افادہ ہوگیا

اقامۃ

اقامت: قیام۔ قرار۔ سکونت۔ نماز باجماعت کی تکبیر

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

اقامہ: قیام گاہ جیسے دارالاقامہ یعنی بورڈنگ ہاؤس

امارۃ

امارت: دولت مندی۔ سرداری۔ شان وشوکت (Authority)

امارہ: حکومت، جیسے دارالامارہ یعنی دارالحکومت (Capital)

اہلیۃ

اہلیت: لیاقت۔ استعداد۔ قابلیت۔ شرافت۔ سلیم الطبعی

اَہلیہ: زوجہ۔ بیوی۔ خاتونِ خانہ

باطنیۃ

باطنیت: فرقہ باطنیہ کا عقیدہ رکھنا اور اس کا ہمنوا ہونا۔

باطنیہ: اہل تشیع کا ایک فرقہ، جو حضرت امام جعفر صادق کو زندہ ومستور مانتا ہے۔ اس کے اعتقاد میں ہر شرعی امر کے ایک ظاہری معنی ہوا کرتے ہیں اور دوسرے باطنی۔

تعزیۃ

تعزیت: ماتم پرسی۔ مرنے والے کے ورثا سے اظہار رنج وغم

تعزیہ: محرم میں جلوس کی شکل میں سوگ منانا۔ حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کی تربتوں کی نقل جو محرم کے دنوں میں کپڑے، بانس اور کاغذ وغیرہ سے بنا کر جلوس میں ظاہر کی جاتی ہے۔

ثقالۃ

ثقالت: گرانی۔ بوجھل پن۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ الفاظ کی ثقالت سے فصاحت نہیں رہتی

ثقالہ: پاسنگ کا بوجھ

جبریۃ

جبریت: غرور۔ تکبر۔ دباؤ۔ تشدد۔ سختی۔ زبردستی

جبریہ: قدریہ کا متضاد۔ اسلام کا ایک فرقہ جس کا عقیدہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال وافعال پر کوئی اختیار نہیں اور وہ تقدیر کے آگے مجبور ہے۔

جرثومۃ

جرثومت: اصلی جڑ

جرثومہ: وہ چھوٹا کیڑا جو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتا اور مختلف امراض پیدا کرتا ہے۔ جمع: جراثیم

جلالۃ

جلالت: بزرگی۔ بڑائی۔ عظمت۔ شان وشوکت۔ رعب ودبدبہ

جلالہ: جیسے جلالۃ الملک (ملک کی شان وشوکت) شاہی لقب

جلوۃ

جلوت: خلوت کا متضاد۔ سب کے سامنے باہر۔ مجمع (Public Place)

جلوہ: نمائش۔ نظارہ۔ ظہور۔ جھلک۔ معشوق کا ناز وانداز اور سج دھج

الغرض شام نے جلوہ جو دکھایا ہم کو
مژدۂ وصل مقدر نے سنایا ہم کو

جمہوریۃ

جمہوریت: عوامی نمائندوں کی حکومت (democracy)

جمہوریہ: وہ ریاست جہاں عوامی حکومت قائم ہو (Republic)

جنسیۃ

جنسیت: ہم قسم ہونا۔ ہم جنس ہونا۔ یکساں ہونا۔ جنسی خواہش یا جذبہ

جنسیہ: جنس (Sex) سے متعلق جیسے امراض جنسیہ

حرارۃ

حرارت: گرمی۔ حدت۔ تپش۔ بخار۔ سرگرمی۔ جوش

حرارہ: جسمانی مقدار حرارت کی اکائی جو غذا سے پیدا ہو۔ (Calorie) غلبۂ شوق، غصہ

کچھ سوزِ دل اپنا کسی دل سوز کے آگے
فرصت ہو تپِ غم کے حراروں سے تو کہیے

حرفۃ

حرفت: صنعت۔ کسب۔ پیشہ۔ چالاکی۔ ہنر۔ مکاری

حرفہ: جیسے اہلِ حرفہ یعنی پیشہ ور۔ ٹریڈ ورک۔ کسی کارخانے کا خاص نشان

حلاوۃ

حلاوت: مٹھاس۔ لذت۔ راحت۔ سکھ

حلاوہ: اردو میں حلاوت کا ایک اور انداز کتابت۔ خواتین کا نام

حماسۃ

حماست: بہادری، دلیری، مردانگی

حماسہ: رزمیہ نظم۔ فخریہ شاعری، جس میں بہادری کے واقعات بیان ہوں مثلاً عرب کی پرانی رزمیہ نظموں کے مجموعے، جن کے مؤلف ابوتمام اور بحتری ہیں۔

خلافۃ

خلافت: نیابت۔ جانشینی۔ خلیفہ کا عہدہ یا منصب۔ نظامِ حکومت۔

خلافہ: اردو میں خلافت کا ایک اور انداز کتابت جیسے دارالخلافہ یعنی صدر مقام (Capital)

خرافۃ

خرافت: بے ہودہ بات۔ عجیب قصے۔ جمع خرافات

خرافہ: کلام بے ہودہ۔ خرافہ عرب کے ایک باشندے کا نام تھا۔ کہتے ہیں کہ اس پر پریاں عاشق تھیں۔ وہ عالم پرستان کا حال سنایا کرتا تھا۔ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے تھے اور وہ جھوٹ میں ضرب المثل ہوگیا۔

دولۃ

دولت: دھن۔ مال۔ زرنقد۔ خوش بختی

دولہ: حکومت جیسے نجم الدولہ (حکومت کا ستارہ) سراج الدولہ (حکومت کا چراغ یعنی سورج)

دہریۃ

دہریت: دہر (زمانہ) سے۔ زمانہ کو ہی خدا تصور کرنا۔ خدا کی ذات کا انکار کرنا۔ الحاد (Atheism0Materialism)

دہریہ: زمانہ کو ہی خدا تصور کرنے والا۔ وہ شخص جو زمانے کو قدیم مانے اور حادث نہ جانے۔ خدا کی ذات کا منکر (Atheist-Materialist)

رجائیۃ

رجائیت: تصویر کا روشن پہلو دیکھنا۔ آئندہ کے بارے میں خوش آئند توقعات رکھنا (Optimism)

رجائیہ: ایسی نظم، نثر اور تقریر جو نا امیدی کی بجائے امید کا تاثر دے۔

رذالۃ

رذالت: کمینہ پن، اوچھاپن

رذالہ: کمینہ۔ کم ذات۔ شریر۔ بدذات۔ بے شرم

رسالۃ

رسالت: رسول کا عہدہ و منصب۔ پیغمبری

رسالہ: نامہ۔ مکتوب۔ کتابچہ۔ میگزین۔ فوجی سواروں کا دستہ

زیادۃ

زیادت: اصطلاح نحو میں کلمے میں ایک یا زیادہ حرفوں کا اضافہ کرنا

زیادہ: فراواں۔ افزوں۔ بہت۔ بیش۔

شرارۃ

شرارت: برائی۔ شوخی۔ بے باکی۔ بدتمیزی۔ بدزبانی۔ شرانگیزی۔ فتنہ طرازی

شرارہ: چنگاری۔ پارۂ آتش۔ آگ کا پتنگا

شربۃ

شربت: قند میں پکا ہوا کسی پھل یا پھول کا عرق۔ مشروب۔ میٹھا لذیذ پانی۔ پینے کی چیز

شربہ: پانی کی چھوٹی مشک۔ تالاب۔ پانی کی وہ مقدار جو سیرابی کے لیے کافی ہو۔

شرکۃ

شرکت: شمولیت۔ حصہ داری

شرکہ: کمپنی۔ فرم۔ کاروبار کی ایسی تنظیم جس میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص بحیثیت مجموعی کاروبار کرتے ہوں۔

شہرۃ

شہرت: چرچا۔ ناموری۔ نیک نامی۔ افواہ

شہرہ: دھوم جیسے شہرۂ آفاق۔ مشہور جہاں۔ دور دور تک مشہور

سرمہ ہے سفاک شہرہ ہے نگاہِ یار کا
سچ کہا ہے پاڑ کاٹے نام ہو تلوار کا
اے صبا شہرہ جو میری اشک باری کا اڑا
ہوگیا معدوم مثلِ سایۂ عنقا سحاب

طریقۃ

طریقت: تصوف کی اصطلاح میں تزکیۂ باطن۔ صوفیہ کا طریقہ جس سے روحانی کمال حاصل ہوتا ہے۔

طریقہ: چلن۔ طرز۔ روش۔ ترکیب۔ گر۔ دستور۔ وضع۔ ڈھنگ۔ راستہ۔

عافیۃ

عافیت: سلامتی۔ امن۔ خیریت۔ آسودگی۔ صحت۔ تحفظ

عافیہ: اردو میں عافیت کا ایک اور انداز کتابت۔ خواتین کا نام

عبقریۃ

عبقریت: ذہانت و فطانت

عبقریہ: ذہن۔ فطین (Genius, Intellectual)

عقلیۃ

عقلیت: عقل پرستی۔ عقل ہی کو تمام علوم کی بنیاد تصور کرنا۔ حقائق کے ادراک میں عقل پر کامل انحصار

عقلیہ: عقل سے متعلق جیسے علوم عقلیہ مثلاً فلسفہ، منطق وغیرہ

عقیدۃ

عقیدت: ارادت۔ مریدانہ اطاعت۔ قلبی رشتہ

عقیدہ: ایمان۔ اعتقاد۔ یقین۔ مذہبی اصول کو ماننا۔

علمیۃ

علمیت: لیاقت۔ قابلیت۔ فہم و فراست۔ ادراک

علمیہ: علم سے متعلق مثلاً مسائل علمیہ

عمدۃ

عمدت: ستون جیسے عمدۃ الملک (حکومت کا ستون)

عمدہ: نفیس، پسندیدہ، منتخب، اچھا، خوب صورت

غزلیۃ

غزلیت: غزل کی کیفیت یا خوبی۔ تغزل

غزلیہ: غزل سے متعلق جیسے غزلیہ شاعری

غنائیۃ

غنائیت: موسیقیت، نغمگی

غنائیہ: پرنغمہ منظوم یا منثور داستان

فضیلۃ

فضیلت: بڑائی، بزرگی۔ فوقیت۔ علمیت

فضیلہ: اردو میں فضیلت کا ایک اور انداز کتابت۔ خواتین کا نام

فوقیۃ

فوقیت: ترجیح۔ سبقت۔ امتیاز

فوقیہ: اردو میں فوقیت کا ایک انداز کتابت۔ خواتین کا نام

کتابۃ

کتابت: تحریر۔ لکھائی۔ خوش نویسی

کتابہ: وہ عبارت جو مقابر اور مساجد کے دروازوں پر لکھوائی جاتی ہے۔

ملایا خاک میں ان کو جہاں کی بے وفائی نے
کتابہ خطِ کوفی میں لکھو گورِ غریباں کا

وہ نظم یا نثر جو کسی کی تعریف میں یا بطور تاریخ خوش طاق پر لکھتے ہیں۔

کفایۃ

کفایت: بچت۔ ہاتھ روک کر خرچ کرنا مثلاً کفایت شعاری۔ نفع۔

بہتات۔ کثرت۔ افراط

کفایہ: کافی ہونا (Sufficiency) جیسے فرض کفایہ، یعنی ایک شخص کی ادائیگی سے جماعت یا گروہ کا فرض ادا ہو جانا مثلاً نماز جنازہ

کلیۃ

کلیت: تمامیت۔ تمام پن۔ اتمام۔ ہمگی

کلیہ: عام قاعدہ۔ فارمولہ۔ ضابطہ۔ فیکلٹی۔ کالج

کنایۃ

کنایت: اشارے سے کہنا۔ سخن پوشیدہ

یہ بھی تقدیر کا لکھا کہ لکھے
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے

کنایہ: رمز۔ مجاز۔ پوشیدہ بات۔ مبہم بات۔

مالیۃ

مالیت: قیمت۔ دولت۔ وقعت

مالیہ: مال گزاری۔ خراج۔ حکومت کی سالانہ آمدنی۔ زمین کی فصل پر سرکاری واجبات (Land Revenue)

محاصرۃ

محاصرت: لڑائی میں قلعہ یا فصیل کے گرد فوج کا گھیرا ڈالنا

محاصرہ: ناکہ بندی۔ چاروں طرف سے گھیرا

مراجعۃ

مراجعت: ریفرنڈم۔ کسی مسئلے پر عوام سے رجوع کرنا۔ رائے شماری۔ شعر میں سوال جواب لانا

مراسلۃ

مراسلت: باہمی خط و کتابت۔ مکاتبت

مراسلہ: خط۔ چٹھی۔ نامہ۔ مکتوب

مرتبۃ

مرتبت: منصب، وقار۔ رتبہ۔ عہدہ جیسے عالی مرتبت

مرتبہ: بار۔ دفعہ (Turn) مثلاً ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ آپ دوسری مرتبہ لاہور نہیں گئے۔ منصب۔ عہدہ

مشورۃ

مشورت: صلاح۔ کونسل (Council)

ع وقت خرام غیر سے کچھ مشورت ہوئی (20)

مشورہ: رائے۔ منصوبہ۔ باہمی تجویز

غم سے شگون تازہ لیا پھر
مشورہ دل سے میں نے کیا پھر

مضاربۃ

مضاربت: لڑائی۔ جنگ۔ باہمی تجارت

مضاربہ: نفع و نقصان کی بنیاد پر مالی شراکت

معاشرۃ

معاشرت: آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ طریق زندگی

معاشرہ: سوسائٹی (Society)۔ جماعتی زندگی۔ سماج

معاملۃ

معاملت: باہم کاروبار کرنا۔ لین دین۔ باہم مل کر کوئی بات کرنا۔

معاملہ: عمل۔ کاروبار۔ فیصلہ۔ قول و قرار۔ قضیہ

معرفۃ

معرفت: تصوف کی اصطلاح۔ سبب۔ ذریعہ۔ عرفان۔ خداشناسی

معرفہ: وہ اسم جو ایک معین شے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ نکرہ کا متضاد

مکاتبۃ

مکاتبت: باہم خط و کتابت کرنا

مکاتبہ: چٹھی۔ خط۔ نامہ۔ مکتوب

مکاشفۃ

مکاشفت: راز کا انکشاف کرنا۔ بھید کھولنا

مکاشفہ: ولی اللہ کو امور غیبی کا معلوم ہو جانا۔ کشف۔ کرامات

ملاطفۃ

ملاطفت: نیکی۔ شفقت۔ عنایت۔ مہربانی

ملاطفہ: عنائیت نامہ۔ مکتوب۔ خط

مناظرۃ

مناظرت: باہمی بحث مباحثہ کرنا

مناظرہ: وہ علم جس میں بحث مباحثے کو قوانین مقرر ہوں۔ جھگڑا۔ تکرار

مناقشۃ

مناقشت: آپس میں جھگڑنا

مناقشہ: نزاع۔ جھگڑا

منزلۃ

منزلت: جاہ۔ (Dignity)

رتبہ۔ (Status) منصب، توقیر، عزت۔ قدر و قیمت

چشم ہمت میں ہماری قدر کیا دنیا کی ہو
ہوتی ہے طالب کے آگے منزلت مطلوب کی

منزلہ: درجے کا جیسے دو منزلہ مکان۔ سہ منزلہ مکان

موضوعیۃ

موضوعیت: موضوع ہونا۔ نفسِ مضمون

موضوعیہ: داخلی۔ (Subjective)

میمنۃ

میمنت: برکت۔ سعادت۔ عروج۔ اقبال مندی۔ خوشی

میمنہ: فوج کے دائیں طرف کا حصہ۔ میسرہ کا متضاد

نظارۃ

نظارت: ناظر کا عہدہ۔ ناظر کا دفتر یا محکمہ۔ نگرانی

نظارہ: منظر۔ سماں۔ تماشا۔ دید بازی۔ جلوہ

چاند سے رخسار کا شب کو نظارہ ہوگیا
چاند سا روشن مری آنکھوں کا تارا ہوگیا

نظریۃ

نظریت: اپنی تحریر یا فکر میں کسی نظریہ کو اجاگر کرنا اور اس پر کاربند رہنا۔

نظریہ: وہ مسئلہ جس میں فکر و نظر سے کام لیا جائے اور اس کی تائید میں ثبوت لایا جائے (Theory)

نہایۃ

نہایت: از حد۔ انجام۔ نتیجہ۔ بکثرت۔ انتہا

جور و ستم کی ان کے جو غایت نہیں رہی
یاں بھی مری وفا کو نہایت نہیں رہی

نہایہ: نہایت ہی کے لیے اردو میں کتابت کا ایک اور انداز جیسے البدایہ والنہایہ

خلاصۂ مباحث: اردو ایک جامد نہیں بلکہ متحرک زبان ہے۔ ضرورت کے مطابق اس میں تغیر ایک فطری امر ہے جس کا امکان اس وقت تک رہے گا جب تک اردو کا چلن باقی رہے گا۔ اردو نے اپنے دامن کی وسعت اور کشادگی کا ثبوت دیتے ہوئے علمی، ادبی، معاشی، ثقافتی، اصطلاحی اور فنی موضوعات پر عربی کے خوبصورت الفاظ و تراکیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔

جزوی تبدیلیوں کے ساتھ مزید الفاظ و تراکیب کی آمد کا امکان ہمیشہ رہے گا۔ خصوصی حالات میں یہ عمل اور بھی تیز اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ احتیاط، بہر طور ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ اس جزوی تبدیلی سے تشکیل پانے والا لفظ مادے (Root) کے اعتبار سے اصل عربی لفظ سے متصادم و متخالف نہ ہو۔

ماخذ اور مصادر:

1. اخبار اردو، جنوری 2009، ج:26، ش:1، ص ص 5-11
2. یوم الظلہ یعنی شامیانے کا دن۔ یہ وہ دن ہے جس میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر شامیانے کی طرح عذاب الٰہی کے بادل چھا گئے تھے اور ساری قوم ہلاک ہوگئی تھی (بحوالہ قرآن مجید، سورۃ الشعراء، رکوع:10) قرشت بھی اسی روز یعنی یوم الظلہ کو ہلاک ہوا۔
3. ابن ندیم، محمد بن اسحٰق، الفہرست، مترجم محمد اسحٰق بھٹی (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ: 1990) ص ص 9-10
4. پنجاب یونیورسٹی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور: پنجاب یونیورسٹی جلد: 1 طبع اول 1964) ص 338
5. نیر، مولوی نور الحسن، نور اللغات، جلد اول (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1989) ص 247
6. عبد المجید، خواجہ، جامع اللغات جلد اول (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003) ص 758
7. نور اللغات جلد دوم، ص 1086
8. سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2003) ص 158
9. جامع اللغات، جلد دوم، ص 1499
10. لشکر کا دایاں حصہ میمنہ، وسطی حصہ قلب، بایاں حصہ میسرہ اور پیشگی بھیجا جانے والا دستہ رسالہ کہلاتا ہے۔

(بہ شکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد، شمارہ اپریل 2009)

□□□

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے "جدید — ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)

قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

عطا عابدی

اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ

اردو زبان کے دیگر زبانوں سے رشتے پر گفتگو کے لیے اردو کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب ''اردو لسانیات'' میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''.....دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتے لسانی مشابہتوں کی بنا پر طے کیے جاتے ہیں۔ لیکن رشتے کئی قسم کے ہیں۔ ماں بیٹی کا رشتہ، خالہ بھانجی کا رشتہ، بہن بہن کا رشتہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ دو زبانوں کی لسانی مشابہتیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ دو زبانیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں، ان میں ایک رشتہ ہے۔ کیا رشتہ ہے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا۔ رشتے کی نوعیت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان زبانوں کے ملتے جلتے سرمایوں میں سے جن کی بنا پر ان کے قریب ہونے کا فیصلہ کیا گیا، کس زبان کا سرمایہ قدیم ہے یا ان دو زبانوں میں سے کس زبان کا سرمایہ ایسا ہے جو دوسری زبان کے سرمائے سے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی زبان کا سرمایہ دوسری زبان کے سرمائے سے زیادہ قدیم ہے یا اس کا کچھ سرمایہ ایسا ہے جو اس کی عزیز دوسری زبان کے سرمائے سے نہیں لیا جاسکتا تو یہ زبان دوسری زبان کی بیٹی نہیں بہن ہوگی اور یہ کہا جائے گا یہ زبانیں کسی تیسری زبان سے ترقی پا کر وجود میں آئیں۔''

اس روشنی میں اردو زبان کو دیکھیں تو اس نے بھی ارتقا کے کئی مراحل طے کیے ہیں اور تغیر وتبدل کی مختلف منزلوں سے گزری ہے اور اس سفر میں اس نے دوسری زبانوں سے رشتہ قائم کرنے میں کبھی تکلف نہیں کیا۔ اردو کا تعلق چونکہ ہند آریائی زبانوں سے ہے لہٰذا ہند آریائی زبانوں سے اردو کا رشتہ خاندانی نوعیت کا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہند آریائی زبانوں کے مختلف مدارج و منازل پیش نظر رکھنے ہوں گے۔ جو انتہائی اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ماہرین لسانیات نے ہند آریائی زبان کے تین عہد مقرر کیے ہیں:

1. قدیم ہند آریائی (1500 ق م سے 500 قبل مسیح تک)
2. وسطی ہند آریائی (500 ق م سے 1000 تک)
3. جدید ہند آریائی (1000 تا حال)

قدیم ہند آریائی: اس کے بارے میں لسانیات کے ماہرین کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر گیان چند نے قدیم ہند آریائی کو ویدک، سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت کے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اسی دور میں چاروں وید یعنی رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید ملتے ہیں۔

وسطی ہند آریائی: پروفیسر اشرف رفیع ''زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا'' میں وسطی ہند آریائی کے تین ادوار بتاتی ہیں۔ پہلا دور 500 ق م سے مسیحی سنہ کی ابتدا تک کا دور ہے۔ یہ دور پالی کا دور ہے۔ یہی پراکرت کا پہلا روپ تھا۔ پالی کو قدیم مگھدی بھی کہتے ہیں۔ دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتدا سے 500 تک شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دور پراکرت کا دور کہلاتا ہے۔ پراکرت کئی زبانوں کے مجموعے کا نام ہے۔

اس عہد کی پانچ پراکرتوں کا ذکر عام طور پر لسانی تاریخوں میں ملتا ہے۔

1. **مہاراشٹری پراکرت:** اس پراکرت کے نام سے ہی اس کے ساتھ مہاراشٹر کا تعلق ظاہر ہے مراٹھی اسی سے نکلی ہے۔
2. **شورسینی پراکرت:** اس کا تعلق متھرا کے علاقے سے ہے۔ اس پر سنسکرت کے اثرات نمایاں ہیں۔
3. **مگدھی یا ماگدھی پراکرت:** ہر چند کہ اس کا مرکز مگدھ یعنی جنوبی بہار تھا لیکن یہ پورے مشرقی ہندوستان کا احاطہ کرتا تھا۔
4. **اردھ ماگدھی:** یہ سب سے قدیم پراکرت ہے اور اس کا مرکز اودھ اور مشرقی اتر پردیش کا علاقہ تھا۔ مغربی ہند کے لوگ اسے ''پراچیہ'' کے نام سے جانتے تھے۔
5. **پیشاچی پراکرت:** اس کا مرکز مغربی پنجاب اور کشمیر کا علاقہ تھا۔ اس پراکرت کا بول چال میں زیادہ استعمال ہوا لہٰذا مخلوط بولیوں کے مرکب کے طور پر اسے جانا جاتا تھا اور اسی وجہ سے سنسکرت کی ہم عصر بولی ہونے کے باوجود سنسکرت علما اسے نگاہ تحقیر سے دیکھتے تھے۔

وسطی ہند آریائی کا تیسرا یعنی آخری دور 500 تا 1000 پر محیط ہے۔ یہ دور اپ بھرنش کا ہے۔ اپ بھرنش کے لفظی معنی پست، افتادہ، گری پڑی چیز ہیں۔ یہ بگڑی ہوئی زبان کے طور پر مشہور رہی ہے۔ اس کے اثرات گجرات، راجستھان اور دوآبہ میں بولی جانے والی زبانوں پر گہرے ہیں۔

لسانیات کا مطالعہ کرنے والوں نے ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرت کے بجائے اپ بھرنش کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں شورسینی اپ بھرنش، مگدھی اپ بھرنش، اردھ مگدھی اپ بھرنش اور مہاراشٹری اپ بھرنش کے نام لیے ہیں۔ شورسینی اپ بھرنش چار بولیوں پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

1. کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اردو ہندی) 2. راجستھانی 3. پنجابی 4. گجراتی

شورسینی اپ بھرنش کی کھڑی بولی وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اور آج بھی کھڑی بولی ہندوستان کی لنگوافرینکا (Lingua Franca) یعنی رابطے کی زبان ہے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چڑجی نے جدید ہند آریائی زبانوں کو مختلف خانوں سندھی، لہندا، پنجابی، گجراتی، راجستھانی، مغربی ہندی اور مشرقی ہندی میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے ایک یعنی مغربی ہندی میں پانچ بولیاں — کھڑی بولی یا ہندوستانی، ہریانوی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی شامل ہیں۔

اگرچہ کھڑی بولی کے دو ادبی روپ اردو اور ہندی ہیں لیکن دیگر بولیوں کے اثرات بھی اردو میں ملتے ہیں۔

جدید ہند آریائی دور کو اپ بھرنشوں کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ اپ بھرنشوں نے خود کو عوامی تقاضوں سے اس قدر ہم آہنگ کیا کہ پراکرتوں کو ایک طرح سے راندۂ درگاہ ہونا پڑا اور سبھی جدید ہند آریائی زبانیں اپ بھرنشوں کے بطن سے وجود میں آئیں۔ ان اپ بھرنشوں کی تعداد پانچ ہے۔

1. شورسینی اپ بھرنش: اس سے کھڑی بولی وجود میں آئی جس سے ہندی اور اردو کی تشکیل ہوئی اور راجستھانی، مشرقی، پنجابی، گجراتی اور پہاڑی بولیاں بھی سامنے آئیں۔

2. ماگدھی اپ بھرنش: اس اپ بھرنش سے آسامی، بنگالی، اڑیہ، مگہی اور بہاری دیگر بولیوں کا ظہور رہا۔

3. اودھ ماگدھی: اس میں پوربی بولیاں آتی ہیں جیسے اودھی، چھتیس گڑھی، بھوجپوری وغیرہ۔

4. مہاراشٹری، پراچڈ اور کیکئی اپ بھرنش۔

اس طرح اردو کا رشتہ قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی زبانوں سے واضح ہو جاتا ہے۔

اردو کا فارسی سے رشتہ:

قدیم ہند آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں سے قطع نظر فارسی کے ساتھ اردو کے کچھ خاص رشتے ہیں اور اردو میں فارسی سے استفادے کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اردو سے فارسی کا رشتہ تب اور بھی مستحکم ہوا جب اردو زبان کے ارتقائی دور میں یعنی بارھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں مسلمانوں کا آنا ہوا۔ مسلمان عربی اور فارسی زبانیں بولتے آئے۔ آگے چل کر جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو انتظامی امور کی زبان فارسی تھی اور طبقۂ امرا اس سے ترجیحی شغف رکھتا تھا۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبان اور مقامی زبانوں کے درمیان ترسیلی اشتراک کے سبب کھڑی بولی تغیرات کے مرحلے میں آگئی۔ اس کا نتیجہ اردو کے ارتقا کی شکل میں برآمد ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو سے فارسی کا یہ رشتہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا چلا گیا۔

اردو سے فارسی کے رشتے کی پہلی بنیاد رسم الخط ہے۔ اردو کا رسم الخط فارسی سے مستعار ہے جسے نستعلیق کہا جاتا ہے لیکن یہ رسم خط اردو زبان سے اس قدر ہم آہنگ ہو گیا ہے، کہ اسے اردو رسم خط کا نام دینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ بہت سے حروف جو عربی یا فارسی میں نہیں ہیں اردو رسم الخط کا حصہ ہیں۔ اردو کے حروف تہجی میں 28 حروف عربی کے اور چار چار حروف فارسی و ہندی کے ہیں۔ یہ تمام حروف اپنی اپنی آواز رکھتے ہیں اور تلفظ کا خاص نظام ترتیب دیتے ہیں جو اردو کی پہچان ہے۔ اردو زبان سے فارسی زبان کے رشتے کو اس کے اعراب و علامات بھی مستحکم کرتے ہیں جو عربی اور فارسی کے توسط سے اردو میں آئے ہیں۔ اسی طرح تنوین، الف وصل، کسرۂ اضافت اور واو معدولہ کا استعمال بھی اردو میں عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ الفاظ کے حوالے سے تو پائیں گے کہ اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً وہ الفاظ جن کا تعلق اہم اسم اور صفت سے ہے جیسے خدا، رسول، نیک، واحد مرکب الفاظ جیسے۔ سخن ور، نوعمر، عیدگاہ، غزل گو، نرم و نازک، حسین و جمیل۔ فارسی کے افعال سے بنائے گئے افعال جیسے فارسی مصدر فرمودن سے فرمانا، آزمودن سے آزمانا، فارسی مصادر سے مشتق مرکب افعال کا استعمال جیسے شمردن سے شمار کرنا، پسند کردن سے پسند کرنا۔ فارسی مرکب افعال سے استفادہ، جیسے توبہ کردن سے توبہ کرنا، فراموش کردن سے فراموش کرنا۔ حروف ربط کا استعمال جیسے قبل از وقت، دراصل، بروقت۔ حروف عطف جیسے و، یا، لیکن، اگرچہ۔ حروف فجائیہ: سبحان اللہ، شاباش، توبہ، افسوس۔ فارسی کے متعدد کلمے، فقرے، محاورے، ترکیبیں اور ضرب الامثال اردو میں مستعمل ہیں جیسے: آفتاب آمد دلیل آفتاب، آمدم برسر مطلب، بے چوں و چرا، خوش آمدید، یار زندہ صحبت باقی، یک جان دو قالب، اشعار کی تقطیع کے اصول اور بحر و وزن بھی فارسی سے ہی اردو میں آئے۔ یعنی بات صرف اردو زبان اور فارسی زبان کے رشتے تک محدود نہیں ہے بلکہ شعر و ادب کے حوالے سے بھی ان دونوں زبانوں کا رشتہ بہت گہرا ہے۔

فارسی کی کئی صنفوں جیسے قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی وغیرہ نے اردو میں اپنی جگہ بنائی۔ اردو شاعری کے ساتھ اردو نثر میں بھی فارسی سے استفادے کی صورتیں ملتی ہیں۔ خصوصاً اردو کی ادبی کہانیوں میں گلستان سعدی اور منطق الطیر سے مستعار خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں۔

اردو زبان کا عربی زبان سے رشتہ:

اردو کے 36 حروف تہجی میں سے 28 حروف عربی کے ہیں۔ اس سے اردو سے عربی کے رشتے کی اہمیت ظاہر ہے۔ اردو میں عربی کے الفاظ ہر چند کہ فارسی کے واسطے سے آئے لیکن وہ اپنی ایک مستقل شناخت رکھتے اور اردو زبان سے اپنے فطری رشتے کی غمازی کرتے ہیں۔ فارسی میں عربی الفاظ ہی نہیں عربی اصناف ادب اور کئی علوم بھی آئے۔ عربی الفاظ و اصناف نیز مختلف علوم جو فارسی زبان و ادب میں شامل ہوئے، فارسی سے اردو میں درآئے۔ مثال کے طور پر عربی قصیدے کی تشبیب سے مماثلت رکھنے والی صنف فارسی میں غزل کے طور پر متعارف ومقبول ہوئی اور یہ صنف اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ علوم میں علم معانی، علم بدیع، علم بیان اور علم عروض، علم بلاغت بھی عربی سے فارسی میں آکر اردو تک پہنچ گئے۔ یہی نہیں، فارسی میں تنقید کی بنیاد بھی عربی ادب کے وسیلے سے پڑی۔ اردو قواعد کے الفاظ و اصطلاحات مثلاً کلمہ، کلام، ماضی، حال، مستقبل وغیرہ بھی عربی قواعد کے الفاظ و اصطلاحات ہیں۔ اسی طرح عربی اضافت کا استعمال اردو میں عام ہے جیسے نور العین وغیرہ۔ عربی جمع کے طریقے (علماء، وجوہ) عربی ضمائر (محترمی، سلمہ)، عربی کے اسماء (عبداللہ، عطاء الحق) اور عربی کی مذہبی اصطلاحات تفسیر، فرائض، فقہ اور حج، زکوٰۃ، نماز وغیرہ اردو میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ یہ اردو زبان کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

اردو زبان کا ہندی زبان سے رشتہ:

اردو زبان کا ہندی زبان سے رشتہ جڑواں بہن کا ہے۔ یہ دونوں زبانیں اپ بھرنش کی کھڑی بولی سے نکلی ہیں یعنی یہ دونوں زبانیں ایک ہی بطن کی پیداوار ہیں۔ گریرسن نے اردو اور ہندی کو کھڑی بولی کے دو روپ قرار دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک میں عربی فارسی کے الفاظ و اثرات زیادہ ہیں دوسری میں سنسکرت کے۔ بہرحال ان دونوں کے درمیان ''ہندوستانی'' کے نام سے ایک ایسی قدر کی بھی تلاش کی گئی جو مذکورہ فرق کو کم سے کم تر اور ایک دوسرے کی قربت کو زیادہ سے زیادہ موثر انداز میں پیش کرتی ہے۔ یہ زبانیں آپس میں اس قدر رابطہ رکھتی ہیں کہ اکثر اوقات رسم الخط کے علاوہ اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ہندی کے مشہور ادیب ارون کمل اردو اور ہندی کے رشتوں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں

''جب ہم اثر قبول کرنے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی باہر کی شے ہم پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ درحقیقت اثر قبول کرنے یا نہ کرنے سے زیادہ بات رشتوں کی ہونی چاہیے کیونکہ اردو ہندی کے لیے غیر نہیں ہے۔ اردو اور ہندی دونوں میں ایسا بہت کچھ ہے جو ایک ہے۔ دونوں کی پیدائش لگ بھگ ایک ساتھ ہوئی ہے۔ دونوں ہی کھڑی بولی کا روپ ہیں۔ دونوں کے بولنے والوں کا علاقہ بھی کم وبیش ایک ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کھڑی بولی ہندی اور کھڑی بولی اردو کے شروعاتی تخلیق کار بھی ایک ہیں۔ امیر خسرو اور ولی دکنی سے چل کر بعد تک۔ یہاں تک کہ جسے صوفیانہ پیرایۂ اظہار کہا جاتا ہے وہ بھی دونوں زبانوں میں عموماً ایک ہی ہے.....''

اردو اور ہندی کی رشتے داری کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی کہ رشتے داریوں کے الفاظ دونوں جگہ ایک ہیں جیسے باپ، بھائی، بہن، چچا، ماموں وغیرہ۔ کچھ متعصب ذہنوں نے اردو اور ہندی کے درمیان رقابت کے بیج ڈال دیے اور ان زبانوں کو مخصوص مذاہب سے منسلک کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ لیکن تاریخی و عملی صداقتیں یہی ہیں کہ ان دونوں زبانوں کے درمیان گہری ہم آہنگی ہے۔ مولوی منظور الحق صاحب کلیم اعظم گڑھی نے آج سے پون صدی قبل (79 سال) لکھا تھا: اردو اور ہندی کے بہی خواہوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دونوں زبانیں بہترین خوبیوں کی مالک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی فنا ہونا مناسب نہیں اور ان کی ترقی خود قوم کی ترقی ہے۔''

ارون کمل نے حالی کے مسدس ''مدوجزر اسلام'' کا ذکر کرتے ہوئے ہندی کی مقبول ترین کویتا ''بھارت بھارتی'' کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ حالی کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' اچاریہ رام چندر شکل سے لے کر ڈاکٹر نامور سنگھ اور ان کے بعد آنے والے ہندی نقادوں کے لیے تنقید کی پہلی کتاب کی طرح ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ہندی دونوں جگہ نئے ادبی رجحانات پیدا ہوئے۔

ارون کمل لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے شروعاتی برسوں میں مکٹ دھر پانڈے سے لے کر نرالا کے عہد ساز مجموعے ''نئے پتے'' ناگارجن، ترلوچن اور دوسرے ہندی کے تخلیق کاروں کے ہاں نظیر کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اقبال نے دنکر اور شمشیر تک کو متاثر کیا۔ اردو افسانے ہندی میں کثرت سے ترجمہ ہوکر شائع ہو رہے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

اردو زبان کا انگریزی سے رشتہ:

ڈاکٹر عبدالمغنی اپنے مضمون ''اردو ادب میں بین الاقوامی تنقیدی رجحانات'' میں لکھتے ہیں:

''......انگریزی دانی کا چرچا ہوا تو اس کا اثر بھی اردو تنقید پر پڑا۔ اس سلسلے میں پہلی قابل ذکر کوشش خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب مقدمہ شعروشاعری ہے۔''

مقدمہ شعروشاعری کے بعد ڈاکٹر عبدالمغنی نے انگریزی سے استفادے

کی جن تنقیدی صورتوں کو پیش کیا ہے، وہ اردو زبان کے انگریزی سے رشتے کو مزید واضح کرتی ہیں۔ دوسرے دور کے انگریزی داں ناقدین میں کلیم الدین احمد ہیں۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر اختر اورینوی ہیں جن تنقیدی تحریروں میں انگریزی زبان وادب سے استفادے کی واضح صورتیں ملتی ہیں۔ تحقیق کے ضمن میں قاضی عبدالودود نے مغربی انداز کی ادبی تحقیقات کو فروغ دیا۔ اردو کی اکثر ادبی اصناف میں جو فلسفیانہ رجحانات پیدا ہوئے یا ترقی پسندی اور جدیدیت کے عناصر شامل ہوئے، ان کے پس پردہ مغربی افکار ورجحانات کی موجودگی دیکھی جاسکتی ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہے کہ اردو زبان کا دیگر زبانوں سے رشتہ کئی حوالوں اور نوعیتوں پر مبنی ہے۔ یہ رشتے جہاں اردو کی دیگر زبانوں کی خصوصیات کو اپنانے کی ہنرمندی ظاہر کرتے ہیں وہیں دوسری زبانوں کو فیضیاب کرنے کی اردو کی فراخدلی کے بھی گواہ ہیں۔

□□□

پتہ:
C/o Book Emporium,
Sabzi Bagh,
Patna-800004

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح واضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق وترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین وتصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی وثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول ودوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

آل احمد سرور

یادِ رفتگاں

ایک چراغ تھا نہ رہا

(شمیم احمد شمیم کی 29ویں برسی پر)

یکم مئی 2009 کو جموں میں اردو کے نامور صحافی شمیم احمد شمیم کی 29ویں برسی منائی گئی اور ان کی صحافتی، سماجی اور سیاسی خدمات کو یاد کیا گیا۔ شمیم احمد شمیم صرف 45سال کی عمر میں وفات پاگئے تھے لیکن اس مختصر سی عمر میں انھوں نے اپنی ہمہ جہت کارکردگی سے نہ صرف اپنے صوبے جموں و کشمیر میں بلکہ پورے ہندوستان میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ ان کی وفات پر پروفیسر آل احمد سرور نے جو مضمون لکھا تھا وہ ان کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتا ہے اور ایک جو انسال دانشور کی ایک بزرگ دانشور کے دل میں کیا قدرومنزلت تھی، یہ بھی واضح کرتا ہے۔ ہم ذیل میں یہ مضمون ''پکار'' کے خصوصی شمارے سے جو شمیم احمد شمیم کی یاد میں شائع کیا گیا ہے، نقل کررہے ہیں۔

ادارہ

شمیم احمد شمیم یکم مئی 1980 کو اس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔ موت تو ہر انسان کا مقدر ہے۔ جو یہاں آتا ہے اسے ایک دن جانا ہے۔ مگر ایسے نوجوان کی موت جو سرتاپا ایک شعلہ تھا، ایک للکار تھا، ایک تلوار تھا، اس کے عزیزوں، دوستوں ساتھیوں اور قدردانوں کے لیے ایک ایسا زخم ہے، جسے وقت بھی بھر نہیں سکتا۔

میں شمیم کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ تقریباً پچیس سال سے اسے جانتا تھا، ایک نڈر، بے باک اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے پہلے میں نے اسے جانا۔ پھر ایک ایسے نوجوان کی حیثیت سے جس میں شوخی تھی اپنے پر اعتماد تھا، ادبی ذوق تھا تقریر اور تحریر دونوں میں ایک بانکپن تھا۔ ایک انفرادیت تھی، زبان کے برتنے کا سلیقہ تھا۔ اس کے ساتھ ادیبوں کے لیے ایک احترام، دانش وروں کے لیے ایک اُنس، فن کاروں کے لیے دل میں جگہ، دوستوں کے لیے بے پناہ محبت اور ان کی ہر حال میں خدمت کا جذبہ تھا۔ شمیم کم عمر میں نہ صرف اپنے ہم عمر ساتھیوں میں ممتاز تھا، اس نے سرینگر کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور ذہنی زندگی میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ ارباب نظر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ نوجوان آگے چل کر نہ صرف کشمیر کی زندگی میں بلکہ ملک میں بھی بلندی کے اونچے سے اونچے درجے طے کرے گا۔

1959 میں یونیورسٹی کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں سرینگر آنا ہوا۔ اس وقت شمیم انفارمیشن کے شعبے میں تھا۔ ایک سکوٹر خرید لیا تھا۔ اس لیے آسانی سے ہر ایک سے مل سکتا تھا۔ اس زمانے میں وہ بخشی صاحب کے خاصا قریب تھا اور اسی نے ان سے میری ملاقات کا وقت مقرر کرایا تھا۔ ''تعمیر'' کی ادارت کے زمانے میں اس کی ادبی صلاحیت آشکار ہوئی۔ اس کے خاکوں اور تبصروں کو جمع کیا جائے تو آج بھی وہ لطف سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں ایک انفرادی نظر، ایک ادبی حسن، ایک رعنائی فکر، خاصی نمایاں ہے۔ بخشی صاحب سے بعد میں اختلاف ہوگیا اور شمیم نے ملازمت چھوڑ دی۔

اس نے 1963 سے 1965 تک علی گڑھ میں قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تعلیم حاصل کی۔ اردو میں ایم۔اے۔ پریوس کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ فائنل کرنے کا ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں وہ وہاں کی تعلیمی، ادبی اور عملی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتا رہا۔ جب کوئی ممتاز سیاست داں یا مقرر علی گڑھ آکر تقریر کرتا تو اکثر شمیم بحث کے دوران اپنی خطابت، اپنی نکتہ سنجی اور اپنی ظرافت کی وجہ سے، مقرر سے زیادہ مجمع پر حاوی ہوجاتا۔ شمیم میں ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ اس زمانے میں بھی وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا تھا۔ جن کا احترام کرتا تھا یا جن سے محبت کرتا تھا، ان سے بھی بحث کرتا، ہاں بحث میں احترام ملحوظ رکھتا۔ مگر جن سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہوتا تھا، ان کے لیے وہ ایک چلتی ہوئی تلوار تھا جس کا وار کم ہی خطا ہوتا تھا۔ 1967 میں آل انڈیا یونیورسٹی اردو اساتذہ کی کانفرنس کے سلسلے میں سرینگر میں آٹھ دس دن ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ میرے بڈشاہ ہوٹل میں قیام کا انتظام شمیم نے ہی کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں ایم۔ایل۔اے ہوچکا تھا اور اس کی معروفیت اور مقبولیت دونوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ''آئینہ'' ہفتہ وار نے اپنی جگہ بنائی تھی۔ اس میں شمیم کے مضامین اور خاکے عام طور پر بڑی دل چسپی سے پڑھے جاتے تھے اور شہر میں ان کا چرچا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں خاصا وقت شمیم کے ساتھ گذرا اور اس کے کئی ذہین دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی جب شمیم محفل میں ہوتا۔ جان محفل ہوتا، اس کے چبھتے ہوئے فقرے، اس

کے لطیفے، اس کے برجستہ استدلال کا نقش بہت گہرا ہوتا تھا۔

اس زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے اس وقت کے پرووائس چانسلر مرزا محمود بیگ نے کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں کشمیر کی ایک پرانی روایت کا ذکر کیا تھا جس کے مطابق ہری پربت کی پہاڑی کے نیچے ایک راکھشس دبا پڑا ہے جو چھ مہینے کے بعد کروٹ لیتا ہے۔ اس ظرافت پر کچھ کشمیر کے نوجوان چراغ پا ہوگئے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے مقالے میں کشمیری کو ایک بولی قرار دیا۔ اس پر ایک جماعت نے اخباروں میں اردو کی اور کانفرنس کی مخالفت شروع کردی اور ان دونوں حضرات سے معافی کا مطالبہ کیا۔ بات شاید بڑھ جاتی۔ مگر شمیم نے دوسرے دن اجلاس میں ایک زوردار تقریر کی جس کے بعد ساری مخالفت ہوا ہوگئی۔ شمیم سے ٹکر لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

شمیم نہ صرف خود بہت اچھی اور معیاری اردو لکھتا، وہ اردو کا حامی اور مبلغ تھا۔ وہ کشمیری کی ترقی چاہتا تھا مگر وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ اردو ریاست کی سرکاری زبان ہی نہیں، ریاست کے تینوں علاقوں میں رابطے کی زبان بھی ہے۔ نیز یہ عرصۂ دراز سے کشمیر کی ادبی اور تہذیبی زبان بھی رہی ہے اور اس کے ریاست میں فروغ سے کشمیری کے فروغ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ہاں اسے مدد ملتی ہے۔ شمیم برابر کشمیری ادیبوں کی تخلیقات پر مضامین اور تبصرے لکھتا رہا۔ ''آئینہ'' میں ہر ہفتے اس نے ایک کشمیری صفحہ بھی شروع کیا تھا جو خاصا مقبول ہوا۔ جب کشمیر میں انجمن ترقی اردو ہند کی ریاستی شاخ قائم کی گئی تو شمیم کو اس کی ایڈہاک کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا تھا۔ بعد میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عام کا ممبر بھی منتخب کیا گیا تھا۔ یہ شمیم کی ادبی خدمات کا ہلکا سا اعتراف تھا۔ افسوس ہے کہ بعد میں پارلیمنٹ کی مصروفیات اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے شمیم کو انجمن ترقی اردو ہند کی ریاستی شاخ کو فعال بنانے کا موقع نہ ملا۔ مگر ریاست میں اور ملک میں اردو کے فروغ کی ہر کوشش سے اس کی گہری دلچسپی برابر رہی۔

1969 میں یونیورسٹی میں چند توسیعی لیکچر دینے کے لیے میرا پھر سرینگر آنا ہوا۔ ان لیکچروں میں شمیم نے شرکت کی اور ریڈیو کے مشاعرے میں جو ممتاز شعرا آئے تھے، ان کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ اسی زمانے میں مشہور عالم اور کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر آصف فیضی بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی شمیم کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق، اس زمانے میں چیف منسٹر تھے۔ انھیں ادب سے گہری دلچسپی تھی اور اردو کے معیاری اشعار یاد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر کمیٹیوں کی نشستوں میں وہ اور شمیم ایک دوسرے کو پرچے پر شعر لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شمیم کی چھوٹی بہن کی شادی ہوئی۔ نکاح میں بھگوان سہائے گورنر، چیف منسٹر صادق اور شیخ عبداللہ یہ تینوں حضرات ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوئے تھے موجود تھے۔ اب سرینگر کے ممتاز ترین شہریوں میں اور کشمیر کے نوجوانوں کے رہنماؤں میں شمیم کا نام عام طور پر لیا جاتا تھا۔

1971 میں صادق بہت بیمار رہے۔ ان کے گردے کا فعل عرصے سے خراب تھا۔ آخری علالت میں وہ چنڈی گڑھ لے جائے گئے۔ وہاں شمیم بھی ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ ارباب اقتدار کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی بیمار ہوں انھیں ظاہر یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور سب باتیں معمول کے مطابق ہیں۔ شمیم ملنے گئے تو وہاں فوج کے کمانڈر ان چیف بھی تھے۔ وہ گئے تو صادق نے شمیم کو اشارے سے قریب بلایا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں فیض کا یہ شعر پڑھا:

کرو کج جبیں پہ سر کفن
مرے دشمنوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن
پس مرگ میں نے بھلا دیا

شمیم نے صادق کے متعلق اپنے تاثرات ''آئینہ'' میں قلم بند کرتے ہوئے اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ کیا خبر تھی کہ فیض کا یہ شعر جو صادق نے اپنے آخری دنوں میں پڑھا تھا، شمیم کے بھی حسب حال ہوگا۔ ''غرور عشق کے بانکپن'' میں مجھے تو شمیم کے ہم عصروں میں کوئی اس کا ثانی نظر نہیں آتا۔

1971 کے لوک سبھا کے الیکشن میں شمیم نے بخشی غلام محمد کو شکست دی۔ بلاشبہ اس شکست میں شیخ محمد عبداللہ کی درپردہ اور بیگم شیخ محمد عبداللہ کی اعلانیہ حمایت اور عملی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔ مگر یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت بخشی صاحب کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے سیاست کے کھلاڑی اور سورما، باوجود شیخ صاحب کے ترغیب دلانے کے بخشی صاحب کے خلاف میدان میں آنے کے لیے تیار نہ تھے، اس مشکل میں یہ نوجوان ہمت کر کے سامنے آیا۔ بڑے کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ بقول فردوسی:

زمیں شش شدہ آسماں گشت، ہشت

مگر بالآخر بقول آصف فیضی داؤد نے جالوت کو نیچا دکھا دیا...... شمیم کی یہ فتح کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانے میں شمیم نے اپنی خطابت، اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنی معاملہ فہمی کی دھاک بٹھا دی۔ وہ آزاد ممبر تھا اور سیاسی پارٹیوں کے نقارخانے میں ایک آزاد طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی تھی کہ ہر اہم مسئلے پر چار پانچ مقرروں میں ایک شمیم بھی ہوتا تھا۔ یوں تو آزادی کے بعد سے کشمیر کے نمائندے برابر پارلیمنٹ میں جاتے رہے اور ان میں ممتاز سیاسی شخصیتیں بھی تھیں مگر حق بات یہ ہے کہ کشمیر کی نمائندگی جس طرح شمیم نے

کی کسی اور نے نہیں کی۔ کشمیر کے مسئلے کو قومی نقطۂ نظر سے بیان کرنا کشمیر کی شخصیت، اس کی علاقائی خصوصیات، اس کی سیاسی جدوجہد کو صحیح پس منظر میں پیش کرنا اور شیخ عبداللہ کی طرف جو مسلمہ طور پر کشمیر کی تحریک حریت کے راہ نما اور نئے کشمیر کے معمار اعظم ہیں حکومت ہند کے دست تعاون بڑھانے پر اصرار کرنا شمیم کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس پر کسی طرح خاک نہیں ڈالی جا سکتی۔

شمیم کی سیاسی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ ان کی تفصیل کا اور ان پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ہے۔ 1977 میں شمیم کی آنکھ میں تکلیف ہوئی اور وہ علاج کے لیے لندن گیا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے کشمیر اسمبلی کے لیے شوپیان سے انتخاب لڑا، مگر اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ 1977 کے وسط سے آخر 1978 تک معلوم ہوتا تھا کہ شمیم بالکل تندرست ہیں اور وہ ''آئینہ'' نکالنے میں اور کشمیر کی سیاست میں مصروف رہا۔ مجھ سے اکثر ملاقاتیں رہیں اور میں نے اسے برابر چاق و چوبند، مصروف، لکھتے، بولتے یا بحث کرتے دیکھا۔ نہ کبھی مایوس نہ ملول، نہ دل گرفتہ نہ بیزار۔ ہاں کچھ لوگوں کی غلط روش پر برہم ضرور دیکھا۔

1979 کے شروع میں یہ شبہ ہو گیا تھا کہ ان کے 1977 کے آپریشن سے مرض دور نہیں ہوا، بلکہ اس نے اب جسم کے دوسرے حصوں میں اپنا اثر جما لیا ہے۔ علاج کے لیے وہ دہلی اور ممبئی کے علاوہ امریکا بھی گئے۔ شمیم نے اور ان کے خاندان نے ان کے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کے امریکا میں کشمیری دوستوں نے بھی ان کی ہر طرح دیکھ بھال کی۔ مگر مرض بڑھتا گیا۔ وہ آخر اکتوبر 1979 میں سرینگر واپس آئے تو اسی دن میں ان سے ملنے گیا۔ میری بیوی ساتھ تھیں۔ ان کے چہرے سے اور ان باتوں سے بیماری کی کوئی دھونس نہیں معلوم ہوتی تھی۔ شمیم کی چنگاری کو یہ خوف ناک بیماری بھی ماند نہ کر سکی تھی۔

اس کے بعد کئی دفعہ انھیں دیکھنے گیا۔ بیماری کے متعلق نہ میں نے کچھ پوچھا، نہ انھوں نے کچھ کہا۔ مگر ہندوستان کی سیاست، ادب کی حالت، علی گڑھ کے مسائل اور عالمی میلانات پر باتیں ہوتی رہیں۔ مارچ میں ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ ان کے مرنے سے دو یا تین دن پہلے ملنے گیا تو ان کے بہنوئی نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔ حالت سنی تو احساس ہو گیا کہ اب چند دن کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد ملنے کی ہمت نہ ہوئی اور پہلی مئی کی دوپہر کو سن لیا کہ بالآخر موت نے اس شعلے کو نگل ہی لیا۔

شمیم کشمیر کے ذہن، اس کی اُمنگوں اس کے حوصلوں، اس کے ولولوں کی علامت تھا۔ یہاں کے لوگوں کی ذہانت اور صلاحیت میں کیسے کلام ہو سکتا ہے مگر ان میں شمیم ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ موت کا ظالم ہاتھ اسے موقع دیتا تو وہ کن بلندیوں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ شمیم بڑا جیالا، بڑا بہادر آدمی تھا۔ ایسی سخت اور طویل اور ظالم بیماری میں اس نے جس صبر وضبط اور ہمت واستقلال کا ثبوت دیا اس کی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پینتالیس سال کی عمر میں، جب اس کی ذہنی صلاحیتیں اپنے شباب پر تھیں، اس کا اس طرح دنیا سے رخصت ہو جانا، ایسا دردناک اور اندوہناک واقعہ ہے کہ اسے کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔ مارلو کا یہ فقرہ یاد آتا ہے اور دل کو مسل جاتا ہے Cut is Apollo's Laural Brannch۔ اس کی یاد تازہ رکھنا، اس کے اخبار ''آئینہ'' کو چلانا، اس کے ذہنی ادبی اور صحافتی رول کی اہمیت کو نمایاں کرنا، اس کی حق گوئی اور بے باکی کی روایت کو زندہ رکھنا، ان سب کا فرض ہے جو شمیم کے قریب تھے۔

دیکھنا ہے کہ ہم اپنے اس فرض سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

□□□

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت -/457 روپے

پردیپ جین

پریم چند کا ایک نایاب مضمون ''اتفاق طاقت ہے''

اپنی خودنوشت میں منشی پریم چند رقم طراز ہیں: ''یہ 1920 کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیاں والا باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انھی دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا، غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا، دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی، ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔''

(زمانہ، پریم چند نمبر، صفحہ 57)

پریم چند برطانوی سامراج سے مسلسل جنگ لڑنے والی کانگریس کے حامی تھے۔ تحریک عدم تعاون کے دوران ایک بیس روپئے ماہوار کی سرکاری ملازمت کو ٹھوکر مار دینا صرف حوصلہ مندانہ عمل ہی نہیں بلکہ پریم چند کے کانگریس سے متاثر ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں آزادی کے لیے کانگریس کی جدوجہد کو ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ، حاصل ہوا، مگر پریم چند اپنی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی کانگریس کے حامی تھے اور کانگریس سے ان کے لگاؤ کا آغاز مہاتما گاندھی کے زیرِ اثر نہیں ہوا۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہو جاتا ہے۔

لارڈ کرزن نے 1905 میں بنگال کو تقسیم کرنے کی جو سازش کی اس کے خلاف بنگال کی رہنمائی میں پورے ملک کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ تقسیم بنگال کے خلاف اور سودیشی کی حمایت میں رویندر ناتھ ٹیگور کی رہنمائی میں بنگال کے تمام ادیب اپنے قلم سے آگ اگلنے لگے۔ اس وقت نواب رائے کے قلمی نام سے لکھنے والے منشی پریم چند کب چوکنے والے تھے۔ ''زمانہ'' کے جون 1905 کے شمارے میں ''دیسی اشیا کو کیونکر فروغ ہو سکتا ہے'' اور ''آوازۂ خلق'' کے 14 نومبر 1905 کے شمارے میں ''سودیشی تحریک'' عنوانات کے تحت انھوں نے اپنے دو مضامین شائع کرائے۔ کانگریس کا 1905 کا سالانہ جلسہ پریم چند کے اپنے ضلع بنارس میں منعقد ہوا، جس میں گوپال کرشن گوکھلے کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ پریم چند نے ''زمانہ'' کے نومبر۔ دسمبر 1905 کے مشترکہ شمارے میں ''آنریبل گوپال کرشن گوکھلے'' عنوان کے تحت گوکھلے صاحب کی مختصر سوانح عمری شائع کرائی۔

پریم چند کانگریس کے حامی تھے لیکن انھیں انقلابیوں سے بھی ہمدردی تھی۔ فرانس کے مشہور انقلابی جوزف گیری بارڈی کی سوانح عمری [''زمانہ'' جولائی 1907] اور اٹلی کے رہنما میزینی کی زندگی پر مبنی افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' (''زمانہ'' اپریل 1908) تحریر کر کے، پریم چند بال گنگا دھر تلک کی رہنمائی میں کانگریس کے اندر ابھرنے والے گرم دَل کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا مکمل اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بال گنگا دھر تلک کی رہنمائی میں گرم دَل کانگریس کے اندر 1905 میں ہی وجود میں آ چکا تھا جس کی جدوجہد اندر ہی اندر چل رہی تھی۔ 27 دسمبر 1907 کو کانگریس کا سالانہ جلسہ سورت میں شروع ہوا۔ پہلے ہی دن نرم دَل اور گرم دَل کا جھگڑا ابھر کر سطح پر آ گیا اور نتیجتاً جلسے کی کارروائی ملتوی کرنا پڑی۔ اگلے دن 28 دسمبر 1907 کو تلک صاحب نے جھگڑا مٹانے کی غرض سے ایک تجویز اسٹیج سے پیش کرنے کی اجازت طلب کی جس پر کوئی غور نہ کیا گیا۔ بال گنگا دھر تلک نے جبراً اسٹیج پر جا کر اپنی تجویز پیش کرنے کی کوشش کی تو اسٹیج پر ہی کھلی لڑائی شروع ہو گئی جس میں کرسیاں تک پھینکی گئیں۔ کچھ مورخین نے تو یہاں تک تحریر کیا ہے کہ گرم دَل کی جانب سے کسی نے چپل بھی پھینک کر ماری تھی جو سریندر ناتھ بنرجی کو چھوتی ہوئی فیروز شاہ مہتہ کو جا لگی تھی۔ نرم دَل اور گرم دَل کے اس ٹکراؤ میں کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی جس سے دیگر محبان وطن کی طرح پریم چند کو بھی صدمہ پہنچا۔

پریم چند کی نگاہ میں نرم دَل اور گرم دَل کا اتفاق ہی وہ واحد راستہ تھا جو ملک کو حصولِ آزادی کی جانب لے جا سکتا تھا۔ اپنے انھی جذبات کو زبان دینے کی غرض سے پریم چند نے ایک مضمون تحریر کر کے منشی بشن سہائے آزاد کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''آزاد'' کے مارچ 1908 کے شمارے میں شائع کرایا جس کا عنوان تھا ''اتفاق طاقت ہے''۔ جس طرح ملک کی سیاسی تاریخ میں سورت کانفرنس کی خاص اہمیت ہے اسی طرح پریم چند ادبیات میں یہ مضمون بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو پریم چند کے جذبۂ حب الوطنی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

پریم چند کا یہ اہم مضمون گذشتہ ایک صدی سے گمنامی کے اندھیرے میں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور سے شائع ہونے والے ماہانہ ''آزاد'' کے شمارے آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ خوش قسمتی سے ''آزاد'' کا مارچ 1908 کا شمارہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرہ میں محفوظ رہ گیا جس کے غیر معمولی تعاون سے یہ مضمون پورے سو سال بعد پریم چند ادبیات میں داخل ہو رہا ہے۔

اتفاق طاقت ہے

از منشی نواب رائے صاحب

ہندوستان میں کسی زمانے میں لوگ اس حد تک آرزم جو تھے کہ بات بات پر تلواریں چلتی اور خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ یا اب لوگ ایسے صلح پسند ہوگئے ہیں کہ پتوں کے کھڑکنے سے کان کھڑے ہوتے ہیں۔ اور آہ واویلا مچ جاتی ہے۔ یہ انگریزی راج کی برکت عظمے ہے۔ جب سے سورت کانگریس چند کوتہ اندیش محبانِ وطن کی جابرانہ کارروائیوں سے درہم ہوگئی ہے۔ نیشنلسٹ اور ماڈریٹ دونوں فریق ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے ہیں اور ذمے دار حلقوں سے یہ آواز متواتر سنائی دیتی ہے کہ اب دونوں فریقوں میں اتفاق ہونا امر محال ہے۔ یہاں تک کہ جانبین سے علاحدہ علاحدہ جلسے کیے گئے۔ اور آئندہ کیے جانے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ ہندوستان اپنی آزاد خیالی اور فراخ دلی کے واسطے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہ بات اسی ملک میں دیکھنے میں آتی ہے کہ معمولی پتھروں کے روبرو سر عقیدت خم کرنے والوں سے لے کر اعلے درجے کے آزاد خیال فلاسفر تک بھی ہندو مذہب کے وسیع انجمن کے ممبر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر کانگریس باوجود اس کے کہ وہ قیود مذہب سے آزاد ہے، دو متشابہ خیالات کے فریق کو اپنے حلقے میں جگہ نہیں دے سکتی۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ جبکہ دونوں فریق کا اختلاف فروعی ہے نہ کہ واقعی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اب کی کانگریس میں چند شوریدہ سر نوجوانوں نے بہت غل مچایا اور قوم کے بعض مسلمہ سرغناؤں کو بولنے نہ دیا۔ یہ حرکت ان کی سراسر بیجا تھی۔ کوئی ذی فہم شخص ایسی بے قاعدگیوں کی حمایت نہیں کرسکتا۔ مگر ایسی حالت میں ان حضرات کو جنھیں حب الوطنی کا ادعا ہے، خوش ہونا چاہیے تھا کہ خیر کانگریس کے ساتھ نوجوانوں کو عملی دل چسپی لینے کا شوق تو پیدا ہوا اور انھیں اس کوشش میں اپنی مجموعی طاقت صرف کرنی چاہیے تھی کہ کس طرح اس تازہ جوش کا بہترین استعمال کیا جائے۔ نہ یہ کہ اسے خس کم جہان پاک کے مصداق پر یکبارگی علاحدہ کر دینے کی ضرورت سمجھی جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جب کانگریس برخاست کی گئی تو سب ہادیان قوم مل کر ممبروں کے انتخاب کے متعلق نئی تجویزیں اور قوانین منضبط کرتے۔ ہر ایک صوبہ اور شہر کو اس کی آبادی اور تاجرانہ اہمیت کے لحاظ سے ممبروں کی ایک معین تعداد کے منتخب کرنے کا حق دیا جاتا اور آئندہ سال کانگریس دو چند آب وتاب کے ساتھ معہ ہر دو فریق کے ممبروں کے یکجا منعقد ہوتی۔ اس وقت کسی جماعت کو اس کی شکایت نہ ہوتی کہ ایک فریق نے ایک خاص مقام کے صدہا ڈیلیگیٹ بھرتی کر دیے۔ خیالات انسانی میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور رہے گا۔ یہ قریبا غیر ممکن ہے کہ کل افراد انسانی ایک ہی خیال کے ہوں۔ دنیا میں جہاں کہیں ایسی قومی جماعتیں ہیں وہاں اختلافات تو ہمیشہ اغرار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت تو اعتدال پسند فرقہ خوش ہے کہ ہم نے اپنی جماعت کو خس وخاشاک سے پاک کردیا اور اب ہم کامل اطمینان سے سال بسال جلسے کرتے رہیں گے۔ مگر کیا یہ لوگ اس بات کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ آئندہ اہل اعتدال میں پھر کسی مسئلے پر اختلاف نہ ہوگا۔ اور کیا اس حالت میں پھر کنونشن کی بھی دو جماعتیں نہ ہوجائیں گی؟ اور کیا یہ سلسلہ لامتناہی اس وقت تک جاری نہ رہے گا۔ جب تک کہ کانگریس کٹ چھٹ کر چند بوڑھے آدمیوں کی ایک منڈلی رہ جائے گی۔

دانشمندوں کا دستور ہے کہ ان سے جب کوئی غلطی سرزد ہوجاتی ہے تو بہت جلد نادم ہوتے ہیں اور اس غلطی کو سدھارنے کی فکر کرتے ہیں۔ مسٹر تلک نے سب سے پہلے صلح وآشتی کی آواز بلند کی ہے اور اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے برعکس اعتدال پسند جماعت کے رہبر جو کم از کم بے عنوانیوں کے اسی حد تک ذمے دار ہیں جس حد تک مسٹر تلک اتحاد کے نام سے گھبراتے ہیں۔ گویا یہ ان کی کئی ماہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ انھیں نہ صرف اپنی غلطی پر افسوس ہے بلکہ اس غلطی کو صحیح کر دکھانے کی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ اور کانگریس کی اس علاحدگی کو مسٹر مارلے کے قابل یادگار الفاظ میں ''طے شدہ امر'' سمجھتے ہیں۔ مسٹر تلک سمجھے ہوئے ہیں کہ کانگریس کے باہر ان کی حیثیت کچھ نہیں۔ مگر مسٹر گوکھلے وغیرہ اس خیال میں بھولے ہوئے ہیں کہ اب ہماری اس حرکت سے خوش ہوکر گورنمنٹ ہم پر مراعات خسروانہ کی بھرمار کردے گی۔ وہ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ نیشنلسٹوں کی جماعت چند دنوں سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ اس کے قبل سب لوگ اعتدال پسند ہی تھے۔ اس وقت گورنمنٹ نے ان کے ساتھ کیا رعایت کردی تھی۔ خدا نیشنلسٹوں کا بھلا کرے کہ ان کے شور وغل نے گورنمنٹ کو اعتدال پسند لوگوں کی معروضات پر توجہ کرنے کا وعدہ تو کیا۔ مگر یہ واضح رہے کہ یہ وعدہ اس وقت ہوا تھا جب دونوں فریق ظاہراً متحد تھے۔ اور اگر ان کی علاحدگی کسی اصولی مسئلہ پر خوش مزگی کے ساتھ ہوتی تو ممکن تھا کہ گورنمنٹ اپنے وعدوں کا ایفا کرتی۔ اس خیال سے کہ اعتدال پسند فرقہ نیشنلسٹوں سے الگ رہے اور متفق نہ ہونے پائے مگر اب جبکہ دونوں فریقوں میں بدمزگی پیدا ہوگئی ہے، نفسانیت وشخصیت کا زہر اثر کرگیا ہے اور ان کے متحد ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں نظر آتی تو گورنمنٹ کو ایفائے وعدہ کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب وہ یہ سمجھے گی کہ یہ دونوں ناچاقی وباہمی منازعت کے جوش میں آپ ہی سرد پڑ جائیں گے۔ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک کو دبانے کے لیے دوسرے کی پیٹھ سہلائیں اور تھپکیاں دیں۔ آپ اسے نیشنلسٹوں کی رفتار کے بڑھنے کا خوف مطلق نہیں رہا۔ کیونکہ وہ حضرات جواب اعتدال پسند بن رہے ہیں اگر کسی اصول سے نہیں تو محض اکڑ اور خودداری کے خیال سے نیشنلسٹوں کی جماعت سے محترز رہیں گے اور خواہ گورنمنٹ کی جانب سے مایوس بھی ہوجائیں مگر اعتدال پسند بنے رہیں گے۔ کانگریس کو جو وقار اور

اعزاز ان گذشتہ دو سالوں میں حاصل ہوا وہ اس کے قبل کے بیس سالوں میں بھی نہیں ہوا تھا اور یہ اسی نئی جماعت کا طفیل تھا۔ اب چونکہ دونوں جماعتیں علاحدہ ہوگئی ہیں۔ کانگریس کا گورنمنٹ کی نظروں میں وہی رسوخ اور وقار رہ گیا جو دو برس پہلے تھا۔ وہ حضرات جواب اس علاحدگی سے خوش ہوکر بغلیں بجا رہے ہیں اور بجائے نادم ہونے اور متفق ہونے کی کوشش کرنے کے اس معمولی دراز کو غار بنانے کی فکر کر رہے ہیں۔ انھیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ گورنمنٹ کا وعدہ اسی وقت تک کے لیے تھا جب تک دونوں جماعتیں ایک تھیں۔ اس کا مقصد اب حاصل ہوگیا اور اسے گذشتہ بائیس سالوں سے معلوم ہے کہ ماڈریٹ لوگوں کی عرض داشت کی کیا وقعت کرنی چاہیے۔ اگر مسٹر گوکھلے بینرو جی مہتہ وغیرہ واقعی فلاح قوم کے دل دادہ ہیں تو انھیں اتفاق و اتحاد کے اس موقعے کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اور مسٹر تلک کی مثال سے سبق حاصل کرکے گذشتہ باتوں سے درگزر کرنا چاہیے۔ ضبط، ہمت، استقلال اور عفو۔ یہ حب الوطنی کی پہلی شرطیں ہیں۔ جو لوگ اپنے ہی بھائیوں کے شوروغل اور اختلاف سے جھلا کر جامہ سے باہر ہو جائیں اور انھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں وہ اس سے زیادہ نازک مواقع پر قوم کا کیا ساتھ دیں گے۔ کیا مسٹر بنرجی جیسے محبّ وطن سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اپنے قومی مجمع میں گالیاں کھانا اور مطعون ہونا اتنا مذموم نہیں ہے جتنا قوم کے ایک جزو کو یہ جانتے ہوئے خانہ بدر کرنا کہ گورنمنٹ بہت جلد ان کی ہستی خاک میں ملا دے گی۔ وہ دن ہمارے اعتدال پسند بھائیوں کے لیے ڈوب مرنے کا ہوگا۔ جب اس باہمی شکر رنجی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ گورنمنٹ کا سخت ہاتھ نیشنلسٹوں کی گردن میں ہوگا۔ اور وہ موقع اس سے بھی زیادہ شرمناک ہوگا جب نیشنلیسٹ لوگ گورنمنٹ کے دست تظلم سے واویلا مچائیں گے اور ہمارے اعتدال پسند بھائی تالیاں بجائیں گے۔

□□□

پتہ:
46-B, New Mandi,
Muzaffar Nagar-251001

کلیات راجندر سنگھ بیدی — جلد اول، جلد دوم

مرتب: وارث علوی

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات : 1040، قیمت : -/525 روپے / جلد دوم: صفحات: 655 قیمت : -/380 روپے

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

یوسف کمال

ہندوستان کی اردو صحافت — کچھ توجہ طلب امور

1953 میں قائم کیے گئے پہلے پریس کمیشن کے مطابق ملک میں اخباروں کا سرکولیشن 5.4 فی ہزار تھا جبکہ ملک میں خواندگی کی سطح 16.4 فیصد تھی۔ اتنی کم سطح سے ترقی کرتے ہوئے اخباروں کا سرکولیشن 1957 میں 31 لاکھ اور 1962 تک 50 لاکھ ہوگیا۔ اخباروں کی مجموعی تعداد اشاعت کو ایک کروڑ کا نشانہ پار کرنے میں مزید کئی سال گزر گئے۔ 1977 کے ایک کروڑ کے سرکولیشن سے 2007 کے 14 کروڑ کے نشانے کو حاصل کرنے میں قومی میڈیا نے ترقی کے کئی ہفت خوان طے کیے۔ اس دوران یہ بھی ہوا کہ ملک میں خواندگی کی سطح 64 فیصد تک پہنچ گئی۔ نئے ہندوستان کی تاریخ میں 1970 کا دہا میڈیا کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کی منصوبہ بند معیشت اور ترقی رنگ لارہی تھی۔ ملک صنعت کاری، نئی تعلیم، زرعی اصلاحات اور ٹیکنالوجی کی برکتوں سے متعارف ہورہا تھا۔ تعلیم کا دائرہ پھیل رہا تھا اور سرمایہ کاری کے امکانات روشن ہورہے تھے۔ ہندوستانی میڈیا کے آسٹریلین اسکالر رابن جیفری نے اپنی کتاب ''ہندوستانی صحافت'' میں تجزیہ کرتے ہوئے دکھایا کہ ہندوستانی معاشرے میں پہلی بار ''خواندہ ثقافت'' (Literate Culture) ابھر رہی تھی جس کے معاشرتی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اخباروں کی اشاعت کا پھیلاؤ ناگزیر تھا۔

صحافت کو بڑھاوا دینے میں ہندوستان کی ابھرتی سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھی زبردست کردار ادا کیا۔ انسیٹ کے مصنوعی سیاروں کی ٹیکنالوجی کی مدد سے ہندوستانی میڈیا گزشتہ 25،20 سالوں میں ٹی وی اور انٹرنیٹ جیسی عصری سہولتوں سے مزین ہوگیا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، سیٹلائیٹ کمیونیکیشن اور ملک میں بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری نے بھی ہندوستانی میڈیا کو مہمیز لگائی۔ نہ صرف الیکٹرانک میڈیا میں زبردست تنوع اور پھیلاؤ دیکھنے میں آیا بلکہ پرنٹ میڈیا بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ جس کے نتیجے میں ہندوستانی اخباروں کی اشاعت آسمان کو چھونے لگی۔ انگریزی اور ہندی اخباروں کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے اخبارات کی اشاعت میں بھی زبردست اضافہ ہوا۔ بڑے انگریزی اخباروں کے ساتھ ساتھ ہندی، تلگو، مراٹھی، بنگالی، کنڑ، گجراتی زبانوں کے اخبارات بھی ''ایک ملین'' کلب کے ممبر کا اعزاز حاصل کرگئے۔ ملک میں رجسٹر شدہ اخباروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ حالیہ اعداد وشمار کے مطابق ہندوستان میں اخباروں کی جملہ تعداد 55,780 ہے اور ان کا جملہ سرکولیشن 14 تا 10 کروڑ ہے۔

جنوبی ہند کے سب سے بڑے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر انچیف این رام نے 60 سالہ آزاد ہندوستان کی میڈیا پر ایک جائزے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانی زبانوں کی صحافت نے انگریزی صحافت پر سبقت حاصل کرلی ہے۔ 22 کروڑ 20 لاکھ قارئین کی جملہ تعداد میں 40 فیصد ہندی کے قارئین ہیں جبکہ انگریزی صحافت کا حصہ اب 10 فیصد رہ گیا ہے۔ باقی کے 50 فیصد قارئین ملک کی مختلف ہندوستانی زبانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد اشاعت ایک کروڑ سے تجاوز کرجاتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ گزشتہ 30 برسوں میں ہندوستانی زبانوں کی صحافت مسلسل نمو اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ ہندوستانی صحافت کی 2007 میں آمدنی 85 ارب روپے تھی جس میں 13 فیصد کی شرح سے اضافہ کی بنیاد پر یہ توقع کی جارہی ہے کہ یہ آمدنی بڑھ کر 232 ارب تک پہنچ جائے گی۔ ان حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان کی صحافت کا ہندوستانی میڈیا کے اس وسیع اور متلاطم سمندر میں کیا مقام ہے۔ ایک طرف ہندوستانی زبانوں کی صحافت ترقی کی بلندیوں کو چھورہی ہے تو دوسری طرف اردو زبان کی صحافت ملک کے چھوٹے اخباروں کے زمرے میں اپنی بقا کے لیے سرگرداں نظر آتی ہے۔ اردو صحافت کی یہ حالت ہندوستان میں خود اردو زبان کے حالات کی آئینہ دار ہے۔ جس زبان نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں نہایت مؤثر رول ادا کیا، جس نے ملک کو آزادی کے ترانے دیے، انقلاب زندہ باد جیسے نعروں سے دلوں کو گرمایا اور جس کی صحافت قومی سیاست کی سب سے معتبر نمائندہ سمجھی جاتی رہی، اس کا آزادی کے 60 سال کے بعد یہ مقام ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر میں بھی اس کے اخباروں کا سرکولیشن چند ہزار سے آگے نہیں جاسکا۔ اردو، ہندی زبان کی طرح کل ہند حیثیت کی حامل ہے۔ مردم شماری کے مطابق اس کے بولنے والوں کی تعداد ملک کی آبادی کا 15 فیصد ہے۔ اپنی ابتدا، ارتقا اور ساخت کے اعتبار سے اردو عوامی زبان ہے اور بول چال کی سطح آج بھی شمالی ہند کی تمام ریاستوں کے علاوہ مشرقی، مغربی اور جنوبی ہند میں کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فی الاصل یہ عوامی ترسیل (Mass Communication) کی زبان ہے۔ اسی لیے یہ فلموں، ریڈیو، ٹی وی کی بھی زبان ہے۔ اس کے گیتوں، غزلوں اور نغموں میں ہر ہندوستانی کو اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ اس لیے پرنٹ میڈیا

کے مقابلے میں الیکٹرانک میڈیا میں اردو چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن غور کریں تو ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا میں اس کی یہ مقبولیت ایک سراب سے کم نہیں۔ اہل اردو اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اردو میڈیا میں زندہ ہے۔ اردو کی اس مقبولیت کا تجزیہ کریں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ جہاں یہ الیکٹرانک میڈیا یعنی ریڈیو، ٹی وی اور فلم میں مقبول ہے وہیں پرنٹ میڈیا میں اس کا وجود دن بدن علامتی بنتا جا رہا ہے۔ زبانوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بولیاں صدیوں میں ترقی کر کے زبان کا درجہ حاصل کرتی ہیں جبکہ اردو زبان اپنا چار سو سالہ شاندار تاریخی سفر طے کر کے، ایک معکوس عمل کا شکار ہو کر بازار میں کھڑی ایک بولی کی صورت نظر آ رہی ہے۔ اردو زبان و تہذیب آج اپنے اولین گہوارے یعنی وادی گنگ وجمن میں علامتی طور پر زندہ ہے یا سسک رہی ہے، اردو تعلیم کا ڈھانچہ پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد رونما ہونے والے حالات میں اہل اردو کو مال و جان اور عزت و آبرو کے لالے پڑے تھے۔ زبان کے تحفظ کا سوال ذہنوں سے محو تھا یا پھر ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ویسے بھی کسی لسانی گروہ کی نفسیات شدید جانی و مالی بحران میں تہذیبی اور لسانی ترجیحات سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ گزشتہ ساٹھ برسوں کی اتھل پتھل میں کچھ غیر ہندی ریاستوں میں تہذیبی شعور سے متصف افراد اور انجمنوں نے اردو تعلیم کی شمع کو روشن رکھا جیسے مہاراشٹرا، کرناٹک اور آندھرا کے علاقوں میں کسی نہ کسی درجے میں معیاری اردو تعلیم باقی ہے۔

ان حالات میں ہندوستان کے چند مراکز اس زبان کی صحافت کے وجود کا احساس دلاتے ہیں جن میں حیدرآباد، ممبئی، دہلی، بنگلور، کولکاتا، پٹنہ وغیرہ شامل ہیں۔ حیدرآباد، ممبئی اور دہلی کے اخبارات نے عصری ٹیکنالوجی کے وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اخبارات کو عصری رنگ روپ بخشا ہے۔ بدلتی ٹیکنالوجی نے کاتب کی جگہ کمپیوٹر کے حوالے کر دی ہے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر نے اخباروں کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولتوں نے قومی اور بین الاقوامی خبروں کے بہاؤ کو تیز کر دیا ہے۔ چست ایڈیٹنگ نے روزناموں میں بھی متنوع اور رنگارنگ مواد کے لیے جگہ فراہم کر دی ہے۔ اخباروں کے میگزین سیکشن عصری زندگی کی بوقلمونی اور آب و تاب کے آئینہ دار بن گئے ہیں۔ تاہم اردو اخبارات میں زبان و بیان کی فروگزاشتوں، ترجمے کی غلطیوں اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کی کمی کے بارے میں شکایات کی بھی کمی نہیں۔ ان شکایتوں کو نظرانداز کر دینے کی بجائے ان پر دھیان دینا اور ان کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔

وسائل کی کمی کے باوجود پیش کش، ترتیب اور اہتمام کے لحاظ سے آج کی اردو صحافت عصری معیاروں کو چھونے کی کوشش کر رہی ہے مگر اردو اخبارات کی محدود اشاعت اس راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے۔ معیاری اردو تعلیمی نظام کی کمی کی وجہ سے اردو معاشرے کی نوجوان نسل بڑی حد تک قارئین میں شامل نہیں، نتیجتاً اردو اخبارات ساٹھ سال کی عمر سے متجاوز بزرگوں کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد رفتہ رفتہ ہندو بھائیوں نے اردو سے دوری اختیار کر لی ہے۔ اس لیے اردو صحافت عملاً اب مسلم اقلیت کے سینڈروم (Minority Syndrome) کی نقیب بن گئی ہے۔ محدود اشاعت اور اقلیتی کردار کے نمایاں تر ہونے کی وجہ سے اردو اخبارات ہندوستان کے کارپوریٹ حلقوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکے ہیں اس لیے ان کے پاس اشتہارات کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات ابھی تک چھوٹے اخباروں کے زمروں میں ہی شمار کیے جاتے ہیں۔

لیکن حالات کتنے ہی حوصلہ شکن ہوں ہندوستانی میڈیا میں اردو صحافت کی نمائندگی نہ صرف ہندوستانی سیکولر جمہوریت کا سب سے بڑا تقاضا ہے بلکہ اس ملک کی تکثیری (Pluralistic) تہذیب کی بقا کے لیے بھی بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اقلیتی معاشرے کی تہذیبی اور لسانی شناخت کو قومی سطح پر باقی رکھنے کے لیے اردو اخبارات کا رول اظہر من الشمس ہے۔ ملک کے الیکٹرانک میڈیا (ریڈیو، فلم اور ٹی وی) کی کشش کے سرچشمے بھی بڑی حد تک اردو زبان و ادب کے تخلیقی استھاس (Ethos) سے جڑے ہوئے ہیں جو اس کے لیے کہانیوں، مکالموں، منظرناموں، غزلوں، گیتوں وغیرہ کی صورت میں فیڈرس (Feeders) کا رول ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر اردو زبان و ادب کی Synergy ملک کے برقی میڈیا میں کمزور ہو جاتی ہے تو اس کے لطیف جمالیاتی سوتے خشک ہو جائیں گے اور یہ ایک بڑا تہذیبی خسارہ ہوگا۔

اردو صحافت کا مسئلہ دراصل ہندوستان میں اردو زبان کی تعلیم سے مربوط ہے۔ جب تک اردو کا تعلیمی نظام کمزور رہے گا اردو صحافت، ہندوستانی میڈیا کے افق پر یوں ہی ڈولتی رہے گی۔ اگر اردو صحافت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے تو اردو کی اسکولی تعلیم کا احیا جنگی بنیادوں پر کرنا ہوگا۔ اردو کی اسکولی تعلیم کی بحالی ایک طویل مدتی، مبسوط اور دور رس پروگرام کی متقاضی ہے۔ اب تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ اردو اسکول کے احیا سے نہ ریاستی حکومتوں کو دلچسپی ہے اور نہ مرکزی حکومت کی پالیسیوں میں اس کو کوئی اہمیت دی گئی ہے۔ شعر و ادب، تصنیف و تالیف اور مشاعروں اور سیمیناروں کے لیے ریاستی اردو اکادمیاں اور مرکزی حکومت کے ادارے فراخ دلی کے ساتھ مالی اعانت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اردو کے تعلیمی نظام کے مؤثر قیام پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اردو زبان کے تعلیمی نظام کو بحال کرنے کے لیے سرکاری اداروں، نجی تنظیموں اور رضاکار انجمنوں کے تعاون سے ایک طویل مدتی پروگرام کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مرکزی حکومت کی وزارت فروغ انسانی وسائل کے

شعبۂ تعلیم سے مطالبہ کیا جانا چاہیے کہ پہلے سے موجود انفراسٹرکچر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کیندر ودیالیہ کی طرز پر ملک کے بڑے شہروں میں اردو اسکول قائم کرے جس کا اعلان جناب ارجن سنگھ مولانا آزاد یونیورسٹی کے 2008 کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر کر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دستورِ ہند کے مطابق چونکہ ہر ریاست اسکول کی تعلیم کے باب میں خودمختار ہے اس لیے ریاستوں کی اردو اکادمیوں سے مطالبہ کیا جائے کہ اپنی اپنی ریاست میں کم سے کم ایک معیاری اردو اسکول کے قیام کے لیے اقدامات کریں۔ تیسرے یہ کہ جن ریاستوں میں سرکاری اردو اسکول موجود ہیں ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے اقدامات کیے جائیں مثلاً آندھرا پردیش میں تلگو، انگریزی اور اردو زبانوں کے ایک لاکھ سے زیادہ سرکاری اسکول ہیں جن میں 2000 اسکول اردو میڈیم کے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے بھی زیادہ غیر کارکرد ہیں۔ ایسے اسکولوں کو Activate کرنے کے اقدامات بھی کیے جائیں۔ چوتھے اردو اقلیت کے بعض اداروں نے اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم کے فروغ میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ ایسے اداروں سے بھی خواہش کی جائے کہ وہ اعلیٰ معیاری نجی اردو اسکولوں کے قیام کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کریں جیسا کہ دولت آباد اور گلبرگہ میں بعض نجی ادارے CBSE کے کورس کے تحت معیاری اردو اسکول کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ پانچویں اور آخری تجویز یہ کہ خود اردو صحافیوں کی انجمنوں کو بھی اردو تعلیم کے احیا اور اس کی ترقی کے پروگراموں پر نظر رکھنے کے لیے ایک واچ ڈاگ (Watchdog) کی طرح چوکس رہنا چاہیے تاکہ اردو تعلیم سے فارغ ہونے والے اردو صحافت کے قافلے میں شامل ہو کر اس کے تسلسل کو جاری رکھ سکیں۔

اردو اسکول کے تعلیمی نظام کے احیا سے ہی اردو زبان وصحافت کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس لیے اس مقصد کے حصول کے لیے بہ عجلت تمام نہایت حرکیاتی اقدامات کی ضرورت ہے ورنہ خدشہ ہے کہ اردو زبان کی ملفوظی حیثیت کچھ دیر اور یوں ہی ہندوستانی میڈیا کے افق پر ڈولتی ہوئی کسی وقت بھی دم توڑ دے اور راج ہنس کے سریلے نغمے کی طرح معدوم جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس زبان کی ملفوظی حیثیت کو مکتوبی بنانے میں ہی اردو معاشرے اور صحافت کی بقا کے امکانات مضمر ہیں اور ملک کے اردو معاشرے کے لیے یہ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔

□□□

پتہ:

"Khair" 22-2-277, Noor Khan Bazar,
Hyderabad-500024

وضاحتی کتابیات

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت:-/2693 روپے

بیسویں صدی کے اردو مصنفین

مصنفہ: سنجیدہ خاتون

اس کتاب میں متعلقہ دور کے مصنفین کے ابتدائی حالات، تعلیمی مراحل اور مشاغلِ حیات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ قلم کاروں میں شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محققین، ناقدین، طنز ومزاح نگار اور صحافیوں کے علاوہ سوانح، تاریخ اور اسلامی لٹریچر کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ اردو میں سوانحی حوالوں کی کتابوں کی کمی کھلتی ہے، یہ کتاب اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے جو 147 ادبا کے مختصر تذکروں پر مبنی ہے۔

صفحات: 570، قیمت -/137 روپے

رضوان الرضا رضوان

کلیاتِ اسعد بدایونی — چند توضیحات

اسعد بدایونی (مرحوم) اردو کے جدید شعرا میں ایک امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں جدت کے ساتھ روایت کی پاسداری بھی تھی اور انداز بیان منفرد اور انوکھا تھا۔ بدایوں سے تعلق رکھنے والے اس دور کے جن دو شاعروں نے اپنی شناخت قائم کی اور ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا ان میں پہلا نام عرفان صدیقی کا ہے اور دوسرا نام اسعد بدایونی کا۔ عرفان صدیقی کی شاعری کا جو رنگ و آہنگ ہے اس سے کوئی بھی صاحب دل اور صاحب نظر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اسعد بدایونی نے بھی ان کا اثر قبول کیا مگر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب بھی ہوئے اور ''داستانی غزلیں'' تخلیق کر کے اردو ادب میں ایک نئی مثال قائم کی۔ اسعد بدایونی کے چار شعری مجموعے، ایک انتخاب اور چار نثری کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اسعد بدایونی پورے پچاس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ صحت جسمانی ان کا ساتھ چھوڑ گئی اور 5 مارچ 2003 کو موت نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ ان کے انتقال کے بعد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے طے کیا کہ معین احسن جذبی اور اسعد بدایونی پر علی گڑھ میگزین میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ شعبۂ اردو کے بعض اساتذہ اور بالخصوص ان کی اہلیہ محترمہ اسما خانم (حال مقیم آسٹریلیا) نے ان کا سارا مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام اکٹھا کرنے اور کلیات مرتب کرنے کی ذمے داری ناچیز کو سونپ دی۔ اور میں نے اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی۔ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ میرا مرتب کردہ ''کلیات اسعد بدایونی'' قومی اردو کونسل نئی دہلی نے شائع کر دیا ہے۔ اردو کونسل کے ترجمان ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے دسمبر 2008 کے شمارے میں اس پر محترمہ نجمہ رحمانی کا تبصرہ بھی شائع ہوگیا ہے جس میں تبصرہ نگار نے چند باتوں کی وضاحت چاہی ہے اور اسعد بدایونی کے فکر و فن پر چند مضامین کی شمولیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ضروری ہے کہ ان اہم باتوں کی توضیح پیش کر دی جائے۔ محترمہ نجمہ رحمانی نے تبصرے کے دوسرے پیراگراف میں کتابوں کے نام اور ان کا سال اشاعت درج کیا ہے جس میں ''دھوپ کنارا'' (1977) غلط ہے اسے ''دھوپ کی سرحد'' ہونا چاہیے۔ یہ مرحوم کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔

کلیات میں کلام کی ترتیب اسی انداز پر کی گئی ہے جیسا کہ مرحوم نے خود اپنی زندگی میں اپنے قلم سے درج کیا تھا۔ ہر مجموعے کا نام اس کے سال اشاعت کے ساتھ عنوان دے کر پیش کیا گیا ہے اور یہ عنوانات تقریباً ان کے موضوعات بھی ہیں جیسا کہ تبصرہ نگار نے بھی اسے موضوعاتی ترتیب سمجھ کر مستحسن قرار دیا ہے۔ ابتدائی تین مجموعے ''دھوپ کی سرحد'' (1977)، ''خیمۂ خواب'' (1984)، ''جنون کنارا'' (1992) کے علاوہ نئی پرانی غزلیں 1997 میں دیوناگری رسم الخط میں ان کی زندگی میں چھپ چکی تھیں اور داستانی غزلوں کی بھی اشاعت کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ آخری مجموعۂ کلام ''ورائے شعر'' جس پر مقدمہ جناب توصیف تبسم نے لکھا ہے غالباً وہ خود چھپوانا چاہتے تھے۔ توصیف تبسم صاحب نے مقدمے میں 73 غزلوں کا ذکر کیا ہے اور یہ منتخب غزلیں نومبر 2000 سے قبل کی ہیں۔ ''ورائے شعر'' کے منظر عام پر آنے میں تاخیر ہوئی تو غزلوں کی تعداد بڑھ کر 148 ہوگئی۔ اس درمیان میں مرحوم نے چند نظمیں بھی کہیں۔ ان نظموں میں تین طربیہ و مزاحیہ بھی ہیں۔ یہ سارا کلام انتقال سے قبل کے تقریباً 10 سالوں پر محیط ہے۔

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجلّے ''علی گڑھ میگزین'' 2004 کے خصوصی نمبر میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کو میں کلیات میں جگہ دینا چاہتا تھا اور ترتیب کی پہلی شکل میں ان کے ہر مجموعۂ کلام سے پہلے ایک ایک مضمون شامل کیا تھا مگر اردو کونسل نے یہ طے کیا کہ مرحوم کا کلام شائع ہو جائے اور یہ جو مضامین علی گڑھ میگزین میں شائع ہو چکے ہیں، کلیات میں ان کی شمولیت ضروری نہیں۔ تبصرہ میں کلیات کی قیمت 250 روپے درج ہے جو غلط ہے، اصل قیمت 205 روپے ہے۔

اسعد بدایونی نے چند ہجویہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کلیات میں ان کے لیے جگہ نہیں نکل سکی۔ بعض حضرات نے خواہش ظاہر کی ہے کہ ان نظموں کو ضرور شائع ہونا چاہیے۔ دراصل وہ نظمیں جن شخصیات سے متعلق تھیں ان کی اشاعت سے ان حضرات کی دلآزاری کا خدشہ تھا۔ جناب توصیف تبسم نے اپنے مضمون ''ورائے شعر'' میں جلیل عالی اور حسن عباس رضا پر کہی گئی تاثراتی غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی کلیات میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں انھیں یہاں درج کیا جا رہا ہے تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ اگر کسی صاحب کو مرحوم کا کچھ اور کلام دستیاب ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔ آخر میں دونوں غزلیں درج کی جا رہی ہیں۔ ان سے پہلے پروفیسر شہریار کے ان چار مصرعوں پر سلسلۂ کلام ختم کرتا ہوں:

خواہش مرگ کی سرشاری میں یہ بھی نہیں سوچا
جینا بھی اک کار جنوں ہے اس دنیا کے بیچ
اور لمبے انجان سفر پر چلے گئے ''تنہا''
پیچھے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے مڑ کے نہیں دیکھا

جلیل عالی کے لیے

تخت جزیرے کا حال کیا ہے جلیل عالی
نواگری کا مآل کیا ہے جلیل عالی
بس اک سمندر میں دو جزیرے ہیں آپ اور ہم
یہاں وہاں کا سوال کیا ہے جلیل عالی
نئے دنوں کے لیے بھی خود کو بچا کے رکھو
گئے دنوں کا ملال کیا ہے جلیل عالی
عزیز پوچھیں جو حال تم سے سوال تم سے
یہ مت بتانا ملال کیا ہے جلیل عالی
اسے تم اسعد بدایونی کا ہی گھر بتانا
ہوا جو پوچھے خیال کیا ہے جلیل عالی

حسن عباس رضا کے لیے

کہو کیا حال ہے پیارے حسن عباس رضا
زندہ ہو کس کے سہارے حسن عباس رضا
آسماں اپنا تو تاریک ہے پہلے کی طرح
تم نے دیکھے ہیں ستارے حسن عباس رضا
زیر افلاک بھٹکتے ہیں ازل سے یوں ہی
خواب میرے کہ تمھارے حسن عباس رضا
کوئی محبوب کم آمیز ملا ہے تم سے
کبھی دریا کے کنارے حسن عباس رضا
تم برے شعروں کو سن کر بھی وطن جا پہنچے
بخت اچھے تھے تمھارے حسن عباس رضا

□□□

پتہ:
Jamia Al-Barkaat,
Anoopshahr Road,
Aligarh (U.P.)

کلیاتِ ولی

مرتب: نورالحسن ہاشمی

اردو شاعری کو ایک سمت عطا کرنے والے شیخ محمد ولی (ولی دکنی) سے اردو دنیا بہ خوبی واقف ہے لیکن ان کی کلیات کی مختلف اشاعتوں کے باوجود کلام کی عدم دستیابی اہل ذوق کو کھلتی رہی ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی ترتیب و تدوین یہ کلیات پہلی بار 1989 میں اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہوئی تھی لیکن اس نسخے کی بھی عدم دستیابی کے سبب اکادمی کے اشتراک سے قومی اردو کونسل نے بہ نظر ثانی پروفیسر نثار احمد فاروقی (مرحوم) و بعد ازاں بہ نظر ثالث پروفیسر لئیق صلاح، حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کلیات کے متن کی تصحیح میں ہندو پاک کی تمام دستیاب اہم مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے جس کی وضاحت پروفیسر ہاشمی نے اپنے ''دیباچے''، ''مقدمے'' اور پروفیسر لئیق صلاح نے ''حرفِ چند'' میں کیا ہے۔ ولی کی شاعری کی زبان سے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تجزیہ بھی کلیات میں شامل ہے اور ولی کے کلام کے بعد اس کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 433، قیمت: 148/- روپے

● بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

اقبال محی الدین

دہلی کی ایکولوجی (Ecology)

ہندوستان کی راجدھانی دہلی "دوشہروں" سے مل کر بنی ہے۔ پہلی مغلوں کی "پرانی دہلی" جس کو شہنشاہ شاہ جہاں نے بسایا تھا اور جس میں عہدِ وسطیٰ کی عمارتیں، مسجدیں، حویلیاں، کسٹرے اور بازار وغیرہ ہیں۔ دوسری دہلی وہ جو انگریزوں نے بسائی تھی جس میں نئے طرز کی تعمیرات اور سبزہ زار ہیں۔ اس دہلی کو "نئی دہلی" کہا جاتا ہے۔ یہاں راشٹرپتی بھون، پارلیمنٹ ہاؤس، سکریٹریٹ، سرکاری دفاتر اور عمدہ رہائش گاہیں ہیں۔ ان کے علاوہ دہلی میں کئی "ہرے مقامات" اور اراولی کی پہاڑیاں بھی ہیں۔ یہ سارے عوامل دہلی کی ایکولوجی (Ecology) پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ دہلی کی ایکولوجی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں کے جغرافیائی ماحول پر ایک نظر ڈالی جائے۔

دہلی اوپری گنگا کے میدان کا ایک حصہ ہے جو دریائے جمنا پر آباد ہے اور سطح سمندر سے 720 فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں ریاست اترپردیش اور مغرب، شمال اور جنوب میں ریاست ہریانہ ہے۔ دریائے جمنا دہلی کے مشرقی حصے سے ہوکر بہتا ہے۔

دہلی کے قدرتی حصے کھادر، بانگر، ڈابر اور پہاڑی ہیں۔ دریائے جمنا کے کنارے کا ریتیلا حصہ کھادر کہلاتا ہے۔ جہاں ریت ختم ہو جاتی ہے اس سے ملحقہ حصہ بانگر کہلاتا ہے۔ بانگر کے بعد کا اچھی مٹی والا حصہ ڈابر کہلاتا ہے۔ چٹانی حصے میں اراولی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جو جنوب مغرب تک گیا ہے۔

دہلی کا رقبہ 1483 مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی جو 1991 کی مردم شماری کے مطابق 9370475 تھی، اب بڑھ کر 1.36 کروڑ ہوگئی ہے (عبوری آبادی میزان۔ دستاویزا برائے 2001)۔ یہاں کی آبادی کا تناسب چھ ہزار لوگ فی مربع کلومیٹر ہے۔

دہلی کی آب و ہوا خشک ہے جو سردیوں میں بہت ٹھنڈی اور گرمیوں میں بہت گرم ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں درجۂ حرارت 46oC تک پہنچ جاتا ہے اور سردیوں میں درجہ حرارت 2oC تک گر جاتا ہے۔ میدانی علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے دہلی کی اپنی کوئی آب و ہوا نہیں ہے۔ وہ پاس کے پہاڑی علاقوں یا ریگستانی علاقوں کی آب و ہوا پر منحصر ہے۔ جاڑوں میں جب ہماچل پردیش کے پہاڑی حصوں میں برف گرتی ہے تو ٹھنڈی ہوائیں پنجاب اور ہریانہ کے میدانی حصوں سے ہوکر دہلی میں داخل ہو جاتی ہیں اور یہاں کی آب و ہوا اور درجۂ حرارت کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ ہماچل پردیش سے آنے والی ان ٹھنڈی ہواؤں کو روکنے کے لیے راستے میں نہ تو پہاڑ ہیں اور نہ ہی دوسری رکاوٹیں۔ اس لیے یہ ٹھنڈی ہوائیں براہ راست دہلی میں داخل ہوکر یہاں کی آب و ہوا کو بہت ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح گرمیوں میں جب راجستھان یا اترپردیش کے میدانی حصوں میں گرم ہوائیں چلتی ہیں تو سیدھی بغیر کسی روک ٹوک کے دہلی میں داخل ہوکر یہاں کے درجۂ حرارت کو بڑھا دیتی ہیں۔ اسی لیے یہاں گرمی بھی بہت زیادہ پڑتی ہے۔ یہاں بارش جولائی کے مہینے میں مانسون ہواؤں سے ہوتی ہے اور ستمبر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں سالانہ بارش اوسطاً 65 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

دہلی کا مزید جغرافیائی تجزیہ ہم بعد میں تفصیل سے کریں گے کیونکہ دہلی کی خاص ایکولوجی (Ecology) بھی ان سے ہی جڑی ہوئی ہے۔ پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ایکولوجی کا کیا مطلب ہے اور وہ ہماری زندگی اور دہلی کی زندگی سے کیسے جڑی ہے؟

ایکولوجی کا مفہوم

1960 کی دہائی میں حیوانی سائنس میں بہت تحقیق ہوئی۔ سائنس کی ترقی کے زیرِ اثر انسان کی زندگی میں آسانیوں کے ساتھ ساتھ مشکلات بھی آئیں۔ جیسے آبادی کا بڑھنا، غذا کی کمی، ماحولیاتی آلودگی، سماجی مسائل وغیرہ۔ یہ ساری باتیں ایکولوجی کے دائرے میں آتی ہیں۔

ایکولوجی (Ecology) کا لفظ جرمن زولوجسٹ (ERNST HACKEI نے ایجاد کیا تھا جس کا مطلب ہے "علمِ معیشت حیوانات" ایکولوجی یونانی لفظ OIKOS سے لیا گیا ہے جس کا مطلب "گھر"۔ "رہنے کی جگہ" اور "گھریلو" وغیرہ ہے۔

آبادی کے خلط ملط ہونے اور جانداروں یا Organism اور ان کے گھلنے ملنے سے Ecological System یا نظامِ معیشت حیوانات یا Ecosystem عمل میں آتے ہیں۔ نظامِ معیشت حیوانات کا تعلق ایک طرف تو مٹی، پانی اور غذائیت سے ہوتا ہے تو دوسری طرف غذائیت کو پیدا کرنے والے، اس کا استعمال کرنے والے اور گلنے سڑنے والے اجزا سے بھی ہوتا ہے۔

اگر زمین کے طبعی حالات میں ردّوبدل کیا جائے یا ہو جائے تو اس علاقے کی نظامِ معیشت حیوانات کا توازن بگڑ جاتا ہے جس سے اس جگہ کے

پیڑ پودوں اور حیواناتی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے اور کئی طرح کے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح طبعی حالات اور ایکولوجی میں بہت گہرا رشتہ ہے۔

ایکولوجی کے دو پہلو ہیں۔ (1) پودوں اور پیڑوں کا مطالعہ اور (2) علم حیوانات کا مطالعہ۔ چونکہ حیوانات اپنے کھانے اور رہنے کے لیے پیڑ پودوں پر منحصر ہیں اس لیے Plant Ecology اور Animal Ecology ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔

دہلی کی ایکولوجی

دہلی کے طبعی اور قدرتی ماحول کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں دہلی کے عمل وقوع، طبعی حالات، آب و ہوا، مٹی، پانی کا بہاؤ اور قدرتی نباتات و حیوانات سب ہی شامل ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دہلی اوپری گنگا کے میدان کا ایک حصہ ہے جس کے مشرق میں دریائے جمنا بہتا ہے۔ اس کے مغرب کا حصہ آبی میدان (Alluvial Plain) ہے اور جنوبی و مغربی حصے میں اراولی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ دہلی کا مغربی حصہ کچھ اونچا ہے جو دو ڈھلواں سطحوں کا خطِ اتصال ہے جس کو Ridge کہتے ہیں۔ اس میں پتھریلی زمین کے ساتھ ساتھ جنگل بھی ہیں۔ اسی لیے اس Ridge کو دہلی کا Green Lung بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دہلی کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی آبادی جو یہاں کے ماحول کو کثیف بناتی رہتی ہے یہ Green Lung اس ماحولیاتی کثافت کو صاف کرتا رہتا ہے۔ دہلی کے لیے یہ "ہرا پھیپھڑا" ایک طرح کی "جیون ریکھا" ہے جس کو ہر حالت میں بچائے رکھنا ہے تاکہ یہاں کا صاف ستھرا ماحول قائم رہے۔

دہلی میں آبادی کا اوسط 6 ہزار لوگ فی مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے علاوہ دہلی میں روزانہ 5 لاکھ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں جس کو Floating Population کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی یہاں کے ماحول کو کثیف بناتے رہتے ہیں۔ 1991 اور 2001 کے درمیان دہلی کی آبادی 42 لاکھ سے بھی زیادہ بڑھی ہے۔ ان سب لوگوں کے لیے اچھی فضا، پینے کا صاف پانی، مکان اور غذا وغیرہ کا انتظام کرنا روز بہ روز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر لوگ رہنے کے لیے مکانات بنا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ دن دور نہیں جب یہاں کا ماحول اتنا کثیف ہو جائے گا کہ لوگوں کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ Carbon Mono-oxide کی مقدار کاروں، بسوں اور مشینوں کے دھوئیں سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے مقابلے میں دہلی میں سب سے زیادہ موٹر کاریں، بسیں اور ٹرک وغیرہ ہیں جن سے صوتی آلودگی (Noise Pollution) بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

جنگلوں یا پیڑ پودوں کو کاٹ کر ختم کر دینے سے یا کھیتی کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سیلاب سے زمین کو بہت نقصان ہوتا ہے اور کھیتی تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ صرف جنگل یا پیڑ پودے ہی ہیں جو سیلاب کے پانی کی تیز دھارا کو روکتے ہیں اور مٹی کے کٹاؤ اور کھیتی وغیرہ کو تباہ ہونے سے بچاتے ہیں۔ عمارتی لکڑیوں اور ایندھن کے لیے درخت برابر کاٹے جا رہے ہیں جس کے نتیجے میں حیواناتی معیشت کا توازن بگڑتا جا رہا ہے۔

دریائے جمنا کی کثافت

دریائے جمنا کا پانی بھی گندہ ہوتا جا رہا ہے۔ سارے دہلی شہر کا گندہ پانی نالوں اور بڑے بڑے سیمنٹ کے پائپوں کے ذریعے جمنا میں گرتا رہتا ہے۔ جگہ جگہ جھگی جھونپڑی کالونیاں بن گئی ہیں۔ ان کی گندگی بھی دریائے جمنا میں بہادی جاتی ہے جس سے اس کے پانی میں گندگی کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے پانی میں نائٹروجن اور فاسفورس کی زیادتی ہوتی جا رہی ہے جو آبی حیوانات کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔ دریائے جمنا کو کثیف ہونے سے بچانا بہت ضروری ہے۔ آبادی کے تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے لوگوں نے جمنا کے پاٹ کو مٹی اور بالو سے بھر کر اس پر مکانات بنا لیے ہیں۔ اس کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ جمنا اپنے میں سمٹنے لگی اور گندگی سے بھرتی چلی گئی۔

دہلی میں اور دہلی کے آس پاس بہت سے صنعتی کارخانے کھل گئے ہیں جن میں چمڑے کا سامان، سوتی کپڑے، چینی کے برتن، بناسپتی تیل، دوائیں، بجلی کا سامان، پیتل، تانبے اور اسٹیل کے برتن، مشینیں، کیمیائی کھاد وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے کارخانے بھی دہلی میں ہیں جن کی چمنیوں سے برابر دھواں نکلتا رہتا ہے اور فضا کو مکدّر کرتا رہتا ہے۔ ایسے کثیف ماحول کو اگر کوئی پاک و صاف کر سکتا ہے تو وہ یہاں کی قدرتی نباتات ہی ہے۔ اگر Ridge کے جنگل نہ کاٹے جائیں اور ہرے بھرے پیڑ پودے لگائے جائیں تو وہ کثیف ماحول کی آلودگی کو اپنے اندر جذب کرتے رہیں گے۔ اسی لیے حیواناتی معیشت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ماحول کو ہرا بھرا رکھنا بہت ضروری ہے اور یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ دہلی کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کس طرح کنٹرول میں رکھا جائے۔ دہلی کے آس پاس سٹیلائٹ ٹاؤن (Satellite Towns) کا قیام بھی ضروری ہے تاکہ دہلی کے لوگوں کو وہاں بسایا جا سکے اور صنعتی کارخانے وہاں کھولے جا سکیں۔

کامن ویلتھ گیمس کا دہلی کی ایکولوجی پر اثر

2010 میں دہلی میں دولتِ مشترکہ کھیل (Commonwealth Games) منعقد ہوں گے۔ دولتِ مشترکہ ممالک سے ہزاروں لوگ اس موقعے پر دہلی آئیں گے اور کھیلوں میں حصہ لیں گے۔ دہلی کی آبادی ویسے ہی بہت زیادہ ہے یعنی 1.36 کروڑ۔ اس میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے

علاوہ دہلی میں متحرک آبادی (Floating Population) کا دباؤ بھی اس زمانے میں بہت بڑھ جائے گا۔ اس وقت دہلی میں روزانہ پانچ لاکھ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ مگر دولتِ مشترکہ کھیلوں کے زمانے میں یہ متحرک آبادی بڑھ کر دوگنی یا تین گنی تک ہو جائے گی۔ لوگ دور دراز سے یا نزدیک کے علاقوں سے کامن ویلتھ گیمس دیکھنے دہلی روزانہ آتے جاتے رہیں گے۔ اس سے دہلی کی آبادی اور infrastructure دونوں بہت متاثر ہوں گے۔ لہٰذا یہاں کی ایکولوجی بھی متاثر ہوگی۔

تیراکی کے کھیل دریائے جمنا میں ہوں گے جو ابھی بہت کثیف ہے۔ اس کی صفائی کے لیے دہلی سرکار کی جانب سے پیش رفت ہو چکی ہے۔ امید ہے اس وقت تک دریائے جمنا کی کثافت دور ہو چکی ہوگی اور تیراکی کے کھیل خوش اسلوبی سے انجام دیے جاسکیں گے۔ دہلی کے سبزہ زاروں پر بھی سرکار کافی توجہ دے رہی ہے۔ پیڑ پودے لگائے جا رہے ہیں۔ خوش نما باغات اور پارکوں سے دہلی کو آراستہ کیا جا رہا ہے۔

کامن ویلتھ گیمس کے سلسلے میں دریائے جمنا کے کنارے سے 300 میٹر تک کی حدود کے علاقوں کو صاف کر کے اس جگہ خوبصورت پارک، باغات اور کشادہ سڑکیں وغیرہ بنانے کا پروگرام ہے۔ جو لوگ اس علاقے میں آباد ہیں اور انھوں نے پکے مکانات تعمیر کروا لیے ہیں ان کو توڑ کر دولتِ مشترکہ کھیلوں کے لیے جگہ بھی بنانا ہے اور خوبصورتی بھی لانا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ ان علاقوں کے باشندے نہ تو وہاں سے ہٹنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنی پراپرٹی کو توڑنے دینا چاہتے ہیں۔ دہلی سرکار نے اس سلسلے میں سپریم کورٹ آف انڈیا سے رجوع کیا۔ سپریم کورٹ نے دہلی حکومت کی بات مان لی اور دریائے جمنا کے کنارے سے 300 میٹر تک کے علاقوں کو بالکل صاف کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اس علاقے میں جو جھونپڑیاں، مکانات، دکانیں وغیرہ آئیں گی۔ وہ منہدم کردی جائیں گی۔ اس طرح سے حاصل شدہ زمین پر باغات، پارک اور صاف ستھری چوڑی سڑکیں اور کھیل کے میدان بنائے جاسکیں گے۔ دہلی کے باشندوں میں اور دہلی سرکار میں گفت و شنید چل رہی ہے تاکہ کوئی خاطر خواہ حل نکل آئے جس سے لوگوں کو راحت بھی ہو اور دہلی کی ایکولوجی پر بھی برا اثر نہ پڑے۔

دریائے جمنا کی ایکولوجی نیری (Neeri) رپورٹ کے آئینے میں

کامن ویلتھ گیمز کے انعقاد کے سلسلے میں حکومتِ دہلی کے سامنے کئی ایسے مسائل آگئے ہیں جن کو سلجھانا بہت ضروری ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دولتِ مشترکہ ممالک کے کھیل دہلی میں کہاں منعقد کیے جائیں اور کھیل گاؤں کہاں بنایا جائے؟ کھیل کے لیے بڑے میدان، ہزاروں لوگوں کے رہنے کے لیے پکے مکانات کی تعمیر ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے حکومت کی نظر دریائے جمنا کے متصل فرشی میدان (Riverbed) پر پڑی جس پر کھیل کے میدان، اور کھیل گاؤں کی تعمیر کی جاسکے۔

National Environmental Engineering Research Institute (Neeri) نے اپنی دو سالہ ریسرچ اسٹڈی کی رپورٹ میں یہ بتایا کہ جمنا کا متصل فرشی میدان تعمیری کام، رہائشی پکے مکانات، صنعتی یا تجارتی مراکز بنانے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اپوربا گپتا جو Neeri کے سربراہ ہیں، ان کے زیر نگرانی یہ اسٹڈی رپورٹ تیار ہوئی تھی۔ انھوں نے صرف جمنا کی تہ سے کیچڑ نکالنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کے بعد بہتے پانی کے مصنوعی نالے (Channelization) بنانے کی بات کہی تھی تاکہ اس کے ذریعے جمنا کی غلاظت سے پانی کی صفائی ہوسکے اور دہلی شہر کی گندگی کو جمنا میں گرنے سے روکنے کی سفارش بھی کی تھی۔

Neeri کی سفارش ہے کہ کوئی بھی مستقل پکی تعمیر دریائی فرش (Riverbed) پر نہیں کی جانی چاہیے سوائے دو چھوٹے علاقوں کے اور وہ بھی مصنوعی نالے بنانے کے بعد۔ یہ دو جگہیں وہ ہیں جہاں جمنا بہت زیادہ چوڑی ہے یعنی نظام الدین برج اور اوکھلا بیراج کے درمیان۔ ڈاکٹر گپتا کا کہنا ہے کہ Riverbed پر صنعتی، تجارتی اور رہائشی مراکز نہیں تعمیر ہونے چاہئیں۔ اس کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے تاکہ سیلاب کے پانی کو وہ اپنے اندر سمیٹ سکے اور آس پاس کی رہائشی جگہوں کو ڈوبنے یا نقصان پہنچنے سے بچا سکے۔

Neeri رپورٹ کے مطابق جمنا کے دریائی فرش پر مستقل پکی تعمیرات کی وجہ سے سیلاب کے پانی کا بہاؤ الٹی جانب ہو جائے گا کیونکہ پانی کی روانی کی راہ میں یہ تعمیرات رکاوٹ بن جائیں گی جس سے نشیبی علاقوں کی آبادی سیلاب کی لپیٹ میں آسکتی ہے اور بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوسکتا ہے۔

دہلی جیسے خوبصورت شہر اور ملک کی راجدھانی کو ہر صورت میں ماحولیاتی کثافت سے بچانا ہوگا تاکہ اس کا نظامِ معیشت حیوانات کا توازن قائم رہے۔ اگر ہمارے سائنس داں اس کام میں کامیاب رہے تو دہلی کی ایکولوجی پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اور ہم اپنی آنے والی نسلوں کو ایک خوبصورت اور صاف ستھری دہلی وراثت میں دے سکیں گے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment,
Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University,
Aligarh-202002

حمید سہروردی

ہندو پاک کے ثقافتی رشتے

غیر منقسم ہندوستان کا ایک سطح پر ایک ہی کلچر تھا، دوسری سطح پر اپنے اپنے مذہب کے اثرات کے تحت کچھ دوسرے عناصر بھی شامل ہوگئے تھے۔ تیسری سطح پر علاقے کے لحاظ سے آداب زندگی میں فرق تھا۔ علاوہ ازیں جغرافیائی سطح پر Interier علاقوں کا کلچر الگ تھا جسے قبائلی کلچر کہا جاسکتا ہے لیکن ان میں کلچر کی پہلی سطح کی نشانیاں ہی اہمیت رکھتی ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، کلچر کی تشکیل میں عقائد، رسم و رواج اور سماجی تنظیم کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ پھر ادب، شاعری، فن صنعت وحرفت، اقتصادی صورت حال وغیرہ مل کر کلچر کو ایک خاص شناخت مہیا کرتے ہیں۔ ہر کلچر کی ایک مابعد الطبیعیات بھی ہوتی ہے۔ محض خارجی زندگی یا خارجی آداب زندگی کا نام کلچر نہیں ہوتا بلکہ وہ روحانی عقائد خاص اہمیت رکھتے ہیں جو کلچر کو ایک داخلی نظم عطا کرتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے کلچر میں پہلی سطح پر تو کوئی فرق آج بھی نہیں ہے اور اس رشتے کو مضبوط تر بنانے میں اس زبان کا بہت بڑا دخل ہے جسے اردو کہا جاتا ہے۔ اردو جس کی تشکیل میں عرب وعجم اور وسط ایشیا سے لے کر ہندو ویدانت تک کے اثرات کارفرما ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان کی کئی بولیوں اور زبانوں کا رسم الخط نسخ یا نستعلیق رہا ہے۔ اردو بھی ایک عرصے تک نسخ ہی میں لکھی جاتی تھی پشتو، سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی اور کشمیری زبانوں کا رسم الخط بھی نسخ میں ہے اور بعض نستعلیق بھی لکھی جاتی ہیں، اردو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی Lingua Franca یعنی عام طور پر بولی اور سمجھی جانے والی رابطے کی زبان ہے۔ ہمارے بعض صحافی جب افغانستان پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جس رابطے کی زبان کو ہم ہندوستانی کہتے ہیں، وہاں وہ اسے ''اردو'' کہتے ہیں۔

جب پوری دنیا آہستہ آہستہ ایک گلوبل ولیج میں بدلتی جارہی ہے اور ان سرحدوں کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے جو ملکوں کے درمیان ہی خلیج نہیں بن جاتیں بلکہ انسانوں کے درمیان بھی خلیجیں بن جاتی ہیں تو اس طرح ہم ایک دوسرے کی ترقیوں سے، زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو زبردست فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

گذشتہ برسوں میں کئی پاکستانی باشندوں کے دل کے آپریشن ہندوستان کے اسپتالوں میں ہوئے جو بہت پیچیدہ تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے ہندوستانی ڈاکٹروں کو کیوں ترجیح دی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں سے جو لوگ آپریشن کی غرض سے امریکا یا برطانیہ جاتے ہیں، انھیں پاکستانی کرنسی میں تقریباً 9 لاکھ سے پندرہ لاکھ روپے تک خرچ کرنے پڑتے ہیں جب کہ ہندوستان میں دو لاکھ سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا بلکہ جب اسپتال والوں کو پتہ چلتا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں تو ایک بڑی رقم کی رعایت کردی جاتی ہے۔ پاکستان کے مغنی، شاعر اور فلمی ستارے یہاں آئے تو ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے کیونکہ انھیں نسبتاً ایک بڑا پلیٹ فارم ملا۔ ان مواقع پر نہ کہیں نفرت کی کوئی دھند نظر آتی ہے اور نہ کدورت کا کوئی نشان، شاید ہم اپنی عام زندگی میں بھی ایک دوسرے سے اتنے اخلاص، اتنی مروت سے نہیں ملتے ہیں جس طرح ہم پاکستانی فنکاروں سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے صحافیوں اور دانشوروں کے جو ڈیلی گیشن مختلف اوقات میں پاکستان جاتے رہے ہیں ان کے تاثرات بھی اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ نرملا پانڈے پاکستان کے دورے سے واپس آئیں تو انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ شاید مجھے زندگی میں اتنی خوشی نہیں ملی ہوگی جتنی کہ ان دنوں میں جو میں نے پاکستان میں گزارے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ہمارا میڈیا کچھ کہتا ہے اور پاکستان کے عوام کچھ اور رکھتے ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ پاکستانی خواتین گہرا سماجی شعور رکھتی ہیں اور احتجاج سے بھی کام لیتی ہیں۔ ہندوستان سری لنکا اور پاکستان تینوں میں سب سے زیادہ پارلیمنٹ کی خواتین ممبروں کی تعداد پاکستان میں ہے یعنی 17% فی صد خواتین کا تناسب ہے۔ اس سے بہت سے وہ شکوک، شبہات دور ہوجاتے ہیں، جو میڈیا کے ذریعے پھیلائے جاتے ہیں، اگر ہندو پاک کے عوام ایک دوسرے کے قریب رہے تو پھر کوئی طاقت ان میں نفرت اور کدورت پیدا نہیں کرسکتی۔

ہندو پاک سرکاریں مل کر اب یہ بھی طے کررہی ہیں کہ تعلیمی سطح پر بھی ایک دوسرے کی ترقیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بہت جلد پاکستانی طلبہ کے لیے بھی ایک ریزرویشن کی اسکیم ہے جس کے تحت 5% پاکستانی طلبہ کو بعض یونیورسٹیوں، آئی.آئی.ٹی. اور میڈیکل کا بھی داخلہ دیا جاسکے گا۔ اسی طرح پاکستانی زبانوں اور وہاں کے ادب اور فنون کو سمجھنے کے لیے بھی ہندوستان سے طلبہ جاسکیں گے، بالخصوص پاکستان کے آثار قدیمہ کو ہمارے تعاون کی بڑی ضرورت ہے۔ موئنجوداڑو اور ہڑپہ کے علاوہ ایسے کچھ اور مقامات بھی ہیں جہاں

کھدائی ہونا باقی ہے جن سے قدیم تہذیبوں کا مزید سراغ لگایا جاسکے گا۔

پاکستان کے رسائل میں ہندوستانی اردو ادیبوں اور شاعروں کا تخلیقات اہتمام سے شائع ہورہی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے ادبی رسائل میں اچھی خاصی تعداد پاکستانی قلمکاروں کی ہوتی ہے۔ جس طرح ہم پاکستانی قلمکاروں کی نگارشات کو بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں، اسی طرح پاکستان کے قاری بھی، ہندوستان کی اردو اور دیگر زبانوں کی نگارشات کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں پاکستانی فنکاروں کو شامل کرلیا گیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل ان ادیبوں کے فن پاروں سے واقف ہو۔ ادب ایک ایسا ذریعہ ہے جو وجدانی اور روحانی سطح پر ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاسکتا ہے۔ پاکستانی ادب میں احتجاج کی لے بہت اونچی ہے بالخصوص خواتین کی شاعری میں، ان کے باغیانہ شعور کی مکمل کرنمائندگی ہوئی ہے۔ یہ چیز ہمارے یہاں اتنی توانائی کے ساتھ نہیں آئی ہے۔ پاکستان کی اسما جہانگیر کہتی ہیں کہ پاکستانی عورت کو جتنا دبایا جارہا ہے اتنا ہی اس میں غم وغصہ کی کیفیت بڑھتی جارہی ہے۔ ایک دن وہ ضرور آئے گا جب پاکستانی عورت کو اپنا مقام مل جائے گا۔ ہندوستان کے انیئر نیئر علاقوں میں بھی عورتوں کے حالات اچھے نہیں ہیں، ان کا استحصال ہوتا رہا ہے اور ہورہا ہے۔ مسائل دونوں طرف بڑی حد تک ایک سے ہیں، شدت کا فرق ضرور ہے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں گے تو ان مسائل سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہوسکیں گے۔

□□□

پتہ:
"SAIBAN" Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road, Gulbarga - 585 104 (K.S.)

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملاّ عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملاّ عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند وناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی. گھا نے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

جاوید کامٹوی

موبائل فون کے انسانی صحت پر اثرات

موبائل یا سیلولر فون موجودہ دور کی ایک اہم سائنسی دین ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور الکٹرانکس کے میدان میں زبردست ترقی کے نتیجے میں موبائل آج ہر گھر بلکہ ہر فرد کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکا ہے اس لیے اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں سامانِ تعیش میں شمار ہونے والا سیلولر فون اب زندگی کی ضرورت بن چکا ہے۔ لکھ پتی ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا جاہل، شہری ہو یا دیہاتی، بوڑھا ہو یا جوان ہاتھ میں موبائل دبا نظر آتا ہے اور تو اور اسکولی بچے بھی اس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں جیسے ان کے لیے یہ ایک کھلونا ہو۔ واجب دام اور مارکیٹ میں نو بہ نو ماڈلوں کی آمد سے ہمہ وقت اس کا بازار گرم رہتا ہے۔ پڑوسی ملک سے سستے اور پرکشش سیٹوں نے ایک کریز سا پیدا کر دیا ہے۔ ایسے امپورٹڈ سیٹ میں بھلے بیٹری میں دھماکے کے واقعات ہوئے ہوں مگر انھیں کون خاطر میں لاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں 250 ملین موبائل فون استعمال ہوتے ہیں اور یہ تعداد 2010 تک 500 ملین تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ گویا اوسطاً ہر گھنٹے میں 10 ہزار سیٹ بیچے جاتے ہیں۔ بازار میں نئے ورژن والے سیٹ آ جانے سے پرانے سیٹ فرسودہ سمجھے جانے لگے ہیں اور ان کا مقدر کچرے کا ڈھیر ہوتا ہے۔ الکٹرانک سامان کی بازیابی [ری سائیکلنگ] کی بہتر تکنک نہ ہونے کی وجہ سے یہ کچرا برسوں یوں ہی پڑا رہتا ہے اور انسانی صحت کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

حال میں امریکہ اور یوروپ میں کیے گئے مشاہدوں کے مطابق موبائل فون سے نکلنے والی شعاعیں انسانوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ تاروں میں بجلی کی رو بہنے کے دوران آس پاس ایک برقی مقناطیسی میدان بن جاتا ہے۔ سیٹ سے خاص قسم کی شعاعیں بھی پیدا ہوتی ہیں اسے الکٹرومیگنیٹک فیلڈ (EMF) کہا جاتا ہے یہ شعاعیں غیر مرئی ہوتی ہیں اس لیے ہمیں خطرے کا احساس نہیں ہو پاتا جیسا کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح ریڈیو فریکونسی ریڈیشن RFR ہوتا ہے۔ شعاع پذیری سے انسان کے مختلف اعضا متاثر ہوتے ہیں خاص طور پر دماغ، دل، جلد، کان اور اعصاب وغیرہ۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے پرکھوں کے مقابلے میں 10 گنا سے بھی زیادہ ہم برقی مقناطیسی شعاعوں کے حصار میں ہیں۔ موبائل فون کے علاوہ عام استعمال کی چیزوں ٹی.وی.، لیپ ٹاپ، ڈیسک ٹاپ، ویکیوم کلینر، مائکرو ویو اوون، ہیئر ڈرائیر، پریس، ٹوسٹر کافی میکر وغیرہ سے ان شعاعوں کا اخراج ہوتا ہے۔ گویا دن رات ہم ان کے نرغے میں گھرے رہتے ہیں۔ جس طرح ایکس رے لیب میں کام کرنے والا ٹیکنیشین ڈاکٹر کام کرتے وقت شعاعوں کے اثر سے محفوظ رہنے کے لیے مخصوص لباس استعمال کرتا ہے۔ ویسا لباس ہمارے لیے ہر وقت استعمال کرنا قابلِ عمل نہیں۔ گویا شعاع پذیری کے خطرے سے ہم ہمیشہ دوچار رہتے ہیں۔

شعاع ریزی سے ہمارے جسم کے خلیات کے ڈی.این.اے (کروموزوم) کی ساخت متاثر ہوتی ہے۔ اس کی دہری پٹی میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایک چیز فطرتاً ملی ہے یعنی ہمارا جسم اپنے اطراف اور بدلتے ماحول کے مقابلے میں مناسب تبدیلیاں پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح بہتر ڈھنگ سے حالات کے مقابلے کا اہل ہے۔ توافق یا مطابقت پذیری کی یہ صلاحیت کم و بیش ہر جانور میں موجود ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر "بقائے اصلح Sruvival of the fittest کا نظریہ قائم ہے اور جانوروں کا دنیا میں وجود برقرار ہے۔ مگر اشعاع پذیری کی وجہ سے یہ صلاحیت متاثر ہوتی ہے بالفاظ دیگر ہمارا جسم نئے حالات، نئے دشمن، نئے جراثیم وغیرہ سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور نئی نئی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ جن افراد میں کوئی بیماری پہلے سے موجود ہو اسے بڑھاوا مل جاتا ہے۔ خارش، دماغی کمزوری، کینسر، بانجھ پن، بہرہ پن، چڑچڑا پن، تناؤ، تھکان، بے خوابی، سر درد، کلائی، انگلیوں میں درد، سوء ہضم وغیرہ موبائل کے طویل استعمال سے جنم لیتے ہیں۔ حاملہ خواتین اور بچے تو خصوصی ہدف ثابت ہوتے ہیں اسی لیے حکومت کا منشا ہے کہ 16 برس سے کم عمر کے بچوں کے لیے یہ ممنوع قرار دیا جائے۔ مگر یہاں تو حالت ایسی ہے کہ والدین خود بچوں کو موبائل فون مہیا کرواتے ہیں تاکہ ان سے ہمہ وقت رابطہ بنائے رکھ سکیں۔

مرکزی وزارت صحت کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں کہ موبائل کے بڑھتے سیلاب سے ان شکایات میں اضافہ ہوگا جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک کے مشاہدے بتلاتے ہیں۔ گو کہ ہمارے یہاں ابھی حتمی ثبوت نہیں ملے ہیں مگر اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے وزارت صحت نے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کی ہدایات جاری کر دی ہیں یہ ذمے داری مشترکہ طور پر آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (AIIM)، انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ (ICMR) اور

جواہر لعل یونیورسٹی (JNU) نئی دہلی کے اسکول آف انوائرمینٹل سائنسز کو دی گئی ہے۔ اس مطالعے کا مقصد بھارت میں استعمال ہونے والے الگ الگ قسم کے موبائل سیٹ سے نکلنے والی شعاعوں اور ان کی فریکونسی کی پیمائش کرنا ہے نیز اس بات کی تصدیق کرنا ہے آیا یہ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حدود میں ہیں یا نہیں۔ جلد کی بیماریوں سے متعلق برطانوی ایسوسی ایشن کا یہ مشاہدہ ہے کہ موبائل کے کثرت استعمال سے کان کے پاس خارش کی شکایت پیدا ہوسکتی ہے۔ فون کی اوپری سطح نکل آلود ہوتی ہے جس سے کان کے آس پاس خراش پڑ جاتی ہیں۔ یہ حصہ سرخ ہوجاتا ہے۔ یہ بیماری موبائل ڈرمے ٹائیٹس کہلاتی ہے۔ برٹش ایسوسی ایشن آف ڈرمیٹا ئیٹس کے ڈاکٹر Greham Lowe کے مطابق کوئی شخص اگر نکل کے لیے پہلے سے حساس (الرجک) ہو تو موبائل کے زیادہ استعمال سے اس کے عارضے میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ امریکہ کے میو کلینک کے ذرائع کے مطابق موبائل، زیورات وغیرہ میں مستعمل نکل دھات سے کان، گلے اور متاثر حصوں پر خراش کے نشانات آسکتے ہیں۔ رہوڈ آئی لینڈ کے ایک ادارے نے جب 22 موبائل سیٹوں کی جانچ کی تو ان میں سے 10 میں یہ دھات پائی۔

اس ضمن میں جے این یو میں چوہوں پر تجربہ کیا گیا۔ ان چوہوں کو موبائل سے نکلنے والی شعاعوں کی زد میں رکھا گیا۔ نتائج سے ظاہر ہوا کہ چوہوں کی تولیدی صلاحیت اور دماغ متاثر ہوئے۔ ان کے خلیات کے ڈی این اے کے متاثر ہونے سے کینسر کے امکانات میں اضافہ ہوا۔ نر چوہوں میں Sperm کے کم پیدا ہونے سے بانجھ پن کا امکان پیدا ہوا۔ محکمۂ صحت کا یہ استدلال کہ چوہوں سے حاصل شدہ نتائج انسانوں کے لیے بھی صحیح ثابت ہوسکتے ہیں۔ چنداں غلط نہیں۔ اس لیے احتیاط برتنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اس کا اطلاق انسانوں پر کرنے کے لیے 4000 رضا کاروں کی رضامندی حاصل کی گئی ہے جو خود کو اس تجربے کے لیے پیش کریں گے۔ ان رضا کاروں کے الگ الگ گروپ بنائے جائیں گے۔ پہلے انھیں مختلف ٹیسٹ سے گزارا جائے گا جیسے ان کا ECG, MRI، خون، مادّہ منویہ کی جانچ، جنسی صلاحیت کی جانچ، بلڈ کیمسٹری وغیرہ، پھر ان کے مناسب گروپ بنا کر ماہرین کے زیر نگرانی رکھا جائے گا۔ 100 رضا کاروں کا گروپ ایسا ہوگا جو موبائل فون قطعی استعمال نہیں کرے گا۔ پھر 100-100 کے ایسے گروپ ہوں گے جو دن بھر میں ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے بالترتیب موبائل کا استعمال کریں گے اور اس سے زیادہ طویل وقفوں والا گروپ علیحدہ ہوگا۔ کچھ عرصے بعد ان پر مذکورہ ٹیسٹ دوبارہ کیے جائیں گے۔ اعداد و شمار اکٹھا کر کے ان کا تجزیہ کیا جائے گا۔

مغربی ممالک سے حاصل شدہ حقائق جن عوارض کی تصدیق کرتے ہیں، ہمارے ملک میں ان کے حتمی ثبوت دستیاب نہیں ہیں۔ موبائل کمپنیوں کی تنظیم سیلولر آپریٹرس ایسوسی ایشن آف انڈیا COAI کے مطابق ابھی ان شکایات کے قطعی شواہد موجود نہیں اس لیے ان پر اتنی چیخ پکار بے معنی ہے اور انھیں ہوّا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حکومت کا یہ موقف اپنی جگہ درست ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم بند کمروں میں فون پر سگنل موصول کر کے بات چیت کرسکتے ہیں۔ اس کے ریڈیو سگنل موٹی کنکریٹ کی دیواروں کے پار بھی گزر جاتے ہیں تو انسانی جسم ان کے آگے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ موبائل فون کے بے جا اور طویل استعمال سے اجتناب کیا جائے۔ ہاں بقدر ضرورت استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس کے ہمیشہ کان سے ''چپکے'' رہنے میں خطرات ضرور ہیں۔ یہی بات ہر سائنسی ایجاد پر صادق آتی ہے۔ اس کا میانہ روی سے استعمال فائدے مند ہے۔ لیکن غیر ضروری استعمال ضرر رساں ہے۔

□□□

پتہ:
61/A, "Gulfishan", Civil Colony,
Kalamna Road,
Kamptee-441002
Dist. Nagpur (M.S.)

ہمارا ای میل، آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

کے. صلاح الدین

کانچ کے گولے میں اجالا کیوں کر قید ہوتا ہے

جی ہاں کانچ کے معمولی گولے میں اجالا قید ہوتا ہے اور آپ کی انگلی کی معمولی جنبش سے آزاد ہو کر اندھیرے کو اجالے میں اور تاریکی کو روشنی میں بدل دیتا ہے۔ اس کانچ کے گولے کو بجلی کا بلب کہتے ہیں۔ بجلی یعنی الکٹرک Electric سے آج کا شاید ہی کوئی انسان ناواقف ہو۔ گاؤں کے لوگ بھی نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کی افادیت سے بھی ایک حد تک آشنا ہیں۔

یہ کانچ کے گولے کس طرح بنتے ہیں اور کن کن سائنسدانوں نے اس کے پیچھے سر کھپایا تب ہم تک اس شکل میں پہنچے ہیں۔ بجلی کے بلب بھی اپنی ایجادوں میں سے ایک ہیں جن کی ایجاد کا سہرا کسی ایک سائنسداں کے نہیں باندھا جا سکتا۔

دوسری کئی چیزوں کی طرح بجلی کے بلب بناتے وقت ہم قدم قدم پر خودکار (Automatic) مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جو کم وقت میں بے شمار بلبس (Bulbs) تیار کر لیتی ہیں۔ آپ نے کبھی بلب کو غور سے دیکھا؟ نہیں تو اب غور کیجیے کہ کیا کیا چیزیں بلب کی آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں؟ سب سے پہلے تو کانچ کا حباب آپ کو متوجہ کرے گا۔ پھر اس کے اندر اسپرنگ کی طرح بل کھائے ہوئے تار (Filament) اور ان تاروں کو جوڑنے والے موٹے موٹے دو تار جو کانچ کی نالی میں سے گزرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں ایک قسم کی دھاتی ٹوپی سے جڑی رہتی ہیں اور ٹوپی کے اوپر موٹے موٹے دو نقطے نظر آتے ہیں جو برقی رو کو بلب کے اندر پہنچاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں الگ الگ تیار کی جاتی ہیں اور انھیں بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ ایک دوسرے سے جوڑا جاتا ہے۔ جب ہم کھوج کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے الکٹرک بلب ترقی کے مدارج تک کس طرح پہنچے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایڈیسن کے ابتدائی ڈیزائن (1880) اور سوان Swan (انگلینڈ) کے بنائے ہوئے ڈیزائن اور آج کے بلب میں کتنا واضح فرق ہے۔ تجربات نے ہر دور میں روشنی کی تیزی کو بڑھایا ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ بلبوں میں موٹے تاروں کے سرے پر پیچ دار گچھا Coiled Coilfilament لگایا جاتا ہے۔ جو چاندی جیسی سفید دھات Tungsten سے تیار کیا جاتا ہے اور اس بلب میں Nitrogen اور Argon گیسوں کا آمیزہ بھرا رہتا ہے۔ یہ بلب مضبوط اور پائیدار ہونے کے ساتھ بجلی کی قوت کا صرف دسواں حصہ کام میں لاکر روشنی دیتے ہیں اور باقی قوت کو حرارت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف فلوریسنٹ ٹیوب Fluorescent Tube بجلی کی قوت کو بہت زیادہ روشنی میں تبدیل کر دیتے ہیں اور ہم یہ روشنی بغیر حرارت کے حاصل کرتے ہیں۔ روشنی ٹیوب کو اور بلب کو چھو کر دیکھیے فرق معلوم ہو جائے گا۔

بجلی کا اولین بلب سر جوزف سیوان Sir Joseph Swan نے انگلستان میں اور تھامس الوا اڈیسن Thomas AlvaEdison نے امریکہ میں بنایا اور اسے تجارتی اصول پر ترقی دی۔

بلب میں چونکہ ہوا نہیں ہوتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ شروع سے آخر تک اس کی بناوٹ میں کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی جائے جو بعد میں ہوا کو داخل ہونے میں مدد دے۔

جب بلب گرم ہو جاتا ہے تو اس کی ہر چیز گرم ہو جاتی ہے چنانچہ وہ پھیلتی بھی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حرارت کے اثر سے دونوں ایک ساتھ اور برابر برابر بڑھیں اور پھیلیں ورنہ ان میں شگاف پڑ جائے گا اور ہوا داخل ہو کر فلیمنٹ کو ناکارہ کر دے گی۔ اس لیے یہ کام کافی مشکل ہے اور احتیاط سے کرنا پڑتا ہے۔ خودکار مشین سب چیزیں تو بآسانی اور تیز رفتاری سے سینکڑوں کی تعداد میں بنا کر رکھ دیتی ہیں لیکن یہ تار لگانے میں تھوڑی دیر اور احتیاط کرتی ہیں۔

برقی رو کو ٹوپی سے فلیمنٹ تک پہنچانے کے لیے ابتدا میں پلاٹینم (Platinum) دھات استعمال کی جاتی تھی۔ چونکہ یہ دھات بہت مہنگی ہوتی ہے اس لیے بلب بنانے والوں کو اس جیسی کسی دوسری دھات کی تلاش تھی جو قیمت میں کم ہو اور ساتھ ہی اس جیسا کام انجام دے۔ چنانچہ کچھ لوگ نکل Nickel اور لوہے کا ایک مرکب بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ بلب کا دوسرا اہم ترین حصہ اس کا فلیمنٹ ہوتا ہے جو روشنی پیدا کرنے کا ذمے دار ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بجلی ہر دھات میں سے بآسانی گزر سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، جن دھاتوں میں سے بجلی مشکل سے گزرتی ہے وہ ہیں لوہا، نائیکروم اور ٹنگسٹن (Tungsten)۔ یعنی یہ دھاتیں ایسی ہیں جو برقی رو (Current) کی راہ میں بہت زیادہ مزاحمت پیدا کرتی ہیں۔ برقی رو اس مزاحمت پر قابو پانا چاہتی ہے اس کوشش میں بہت زیادہ حرارت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا درجۂ حرارت بہت زیادہ بلند ہو کر حرارت دینے کے بجائے روشنی دینے لگتا ہے۔

برقی ہیٹر میں سے برقی رو اس کے تار میں سے گزرتی ہے تو اسے بے پناہ مزاحمت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے بے حد حرارت پیدا ہوتی ہے او راسی وجہ سے زیادہ بجلی خرچ ہوتی ہے۔ تار جتنا زیادہ باریک ہوگا وہ اتنی ہی مزاحمت پیدا کرے گا۔

ٹنگسٹن کا تار کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ یہ سوال قدرتی طور پر آپ کے ذہن میں ابھرے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ٹنگسٹن میں قدرتی طور پر یہ صفت پائی جاتی ہے۔ اس کے جتنے چاہے باریک تار کھینچے جاسکتے ہیں۔ ایک ملی میٹر قطر کے گز بھر لیے تار کو کھینچ کر تیس میل تک لمبا کیا جاسکتا ہے۔ جب اس کی لمبائی صرف ساڑھے پانچ میل رہ جاتی ہے تو اس کا قطر (Diameter) ایک انچ کے اڑھائی ویں ہزار حصے کے برابر ہوتا ہے۔ برقی بلبوں میں اتنے ہی پتلے اور باریک فلیمنٹ استعمال کیے جاتے ہیں کیونکہ فلیمنٹ جتنا زیادہ باریک ہوگا وہ اتنی ہی روشنی دے گا۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ بجلی کے بلب مختلف کینڈل پاور (Candle Power) کے ہوتے ہیں۔ قوت کا انحصار فلیمنٹ پر ہے۔ اس لیے باقاعدہ حساب لگا کر یہ طے کیا جاتا ہے کہ پچیس وولٹ کے بلب کے لیے کتنے قطر کا اور کتنا لانبا تار اور سو وولٹ کے بلب کے لیے کتنا۔ اس کے بعد ان دونوں تاروں کے سروں کو سولڈر (Solder) کردیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ کام ذرا مشکل او راحتیاط سے کرنے کا ہے اس لیے زیادہ تر ہاتھ سے ہی کیا جاتا تھا۔

بلب کے لیے جو کانچ (شیشہ) استعمال کیا جاتا ہے وہ بہت عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ مضبوط ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس کا صاف و شفاف بھی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بجلی کے بلب بھی کانچ کی بوتلوں اور شیشوں کے اصول پر ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ اب یہ کام خودکار مشینوں سے لیا جارہا ہے۔ جو ایک دن میں ہزارہا بلب تیار کردیتی ہیں۔ فلیمنٹ میں اگر ہوا کی موجودگی میں برقی رو گزاری جائے تو وہ بہت جلد جل کر راکھ ہوجاتا ہے اس لیے بلب میں سے ہوا نکال دی جاتی ہے۔ یہ کام بھی مشین سے لیا جاتا ہے۔ فلیمنٹ زیادہ عرصے تک چلنے اور روشنی زیادہ دینے کے لیے بلب میں آرگون (Argon) گیس بھر دی جاتی ہے۔

جب فلیمنٹ اور گیس بلب میں داخل کردیے جاتے ہیں تو اس پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ مہر وہی ہے جو آپ کو بلب کی ٹوپی پر سیاہ رنگ کی نظر آتی ہے۔ یہ مہر دو کام ایک ساتھ انجام دیتی ہے۔ ٹوپی کو مضبوطی بخشتی ہے اور باہر کی ہوا کو بلب میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ اسی مہر پر دو سفید دھاتی موٹے موٹے نقطے ہوتے ہیں۔ جو ہولڈر میں لگی اسپرنگوں سے چسپاں ہوجاتے ہیں۔ جب آپ بلب روشن کرنے کے لیے بٹن دباتے ہیں تو برقی رو ہولڈر کی کیلوں سے گزر کر بلب کے اندر داخل ہوتی ہے اور فلیمنٹ روشن ہوکر اندھیرے کو اجالے میں بدل دیتا اور ہماری اندھیری راتوں کو روشن کردیتا ہے۔

□□□

Ashyana-e-Suryya
Yaqut pura,
Hyderabad-500023

کلیات سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساسِ دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے 24 سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا ان میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعروادب میں سراج کی قادرالکلامی مسلم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اسی غرض سے قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ابن کنول

شمالی ہند کی ایک اہم درس گاہ — دہلی یونیورسٹی

دہلی یونیورسٹی کا باقاعدہ قیام 1922 میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل دہلی کے قدیم کالج سینٹ اسٹیفن، ہندو کالج اور رام جس کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا۔ آج دہلی یونیورسٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں ملکی اور غیر ملکی سبھی زبانوں کی تدریس کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں اور تقریباً اسّی کالج اس سے ملحق ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کا باقاعدہ قیام اگرچہ 1922 میں ہوا اور 1959 میں آزاد شعبۂ اردو قائم کیا گیا لیکن یہاں اردو کی تعلیم و تدریس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہ سلسلہ دلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) سے شروع ہوتا ہے جس کا الحاق دہلی یونیورسٹی سے بہت پرانا ہے۔ یہ وہی دہلی کالج ہے جسے 1824 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے قائم کیا تھا۔ اس قدیم کالج کے طلبہ کے ذکر کے بغیر اردو نثر کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی جن میں ڈپٹی نذیر احمد، ماسٹر رام چندر، محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، ذکاء اللہ اور مولوی کریم الدین شامل ہیں۔ بعد میں اسی دہلی کالج کو اینگلو عربک اسکول اور اینگلو عربک کالج کہا گیا۔ اس میں ایم.اے. تک کی تعلیم کا انتظام ہوگیا۔ اس زمانے کے مشہور طالب علموں میں آغا محمد اشرف، فضل حق قریشی، انصار ناصری، صادق الخیری، معین احسن جذبی، مسعود حسین خاں، سردار جعفری، اختر الایمان، جمیل الدین عالی وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو اساتذہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

1947 کے بعد اسے پھر دہلی کالج کا نام دے دیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی میں ابتدا سے عربی، فارسی اور اردو کا مشترکہ شعبہ تھا، ایم.اے. کے داخلے کالجوں میں ہوا کرتے تھے اور کلاسیں دہلی یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی کی عمارت میں ہوتی تھیں۔ دہلی کالج ہی کے اساتذہ یہاں پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ جن میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے قیام کے چند سال بعد ہی دہلی کے اردو ادیبوں نے علاحدہ شعبۂ اردو قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ مسلسل جدوجہد کے بعد 9 نومبر 1959 کو دہلی یونیورسٹی کا علاحدہ شعبۂ اردو قائم ہوا اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ شعبے کا علاحدہ قیام انھی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ 1959 میں ہی پوسٹ گریجویٹ شبینہ کلاسز کی بھی ابتدا ہوئی، جس کے لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر قمر رئیس کا بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔

دہلی یونیورسٹی میں گریجویشن کی تعلیم کالجوں میں ہوتی ہے اور اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے طالب علم یونیورسٹی کیمپس میں چلے آتے ہیں۔ اردو میں گریجویشن کی سہولت دہلی یونیورسٹی سے ملحقہ بارہ کالجوں میں ہے، ان میں دلی کالج یعنی ذاکر حسین کالج کے علاوہ سینٹ اسٹیفن کالج، کروڑی مل کالج، ستیہ وتی کالج، ماتا سندری کالج، خالصہ کالج، دیال سنگھ کالج، لیڈی شری رام کالج، مرانڈا ہاؤس شامل ہیں یہاں سے طلبہ بی.اے. آنرس کے علاوہ بی.اے. (پاس) کی ڈگری حاصل کرسکتے ہیں۔ مذکورہ کالجوں میں سب سے زیادہ اردو اساتذہ کی تعداد ذاکر حسین کالج میں ہے جہاں دن کے علاوہ شبینہ کلاسوں کی بھی سہولت ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے مرکزی شعبۂ اردو میں ایم.اے.، ایم.فل. اور پی.ایچ.ڈی. کے علاوہ بھی کئی کورسیز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو ملکی اور غیر ملکی طالب علم اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے تین سال کی بالترتیب سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور ایڈوانسڈ ڈپلوما کی پڑھائی ہوتی ہے۔ میڈیا کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر شعبے میں پوسٹ ایم.اے. ڈپلوما ان ماس میڈیا اور ٹرانسلیشن کا کورس شروع کیا گیا جسے مکمل کرکے طالب علم اخبار، ٹی.وی. یا ریڈیو پر ملازمت حاصل کرلیتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے مخطوطہ شناسی کے علم کے لیے پوسٹ ایم.اے. ڈپلوما ان ببلیوگرافی کا آغاز کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد کورس ہے اس میں مخطوطہ شناسی کی تعلیم دی جاتی ہے، طالب علم کو مختلف خطوط اور متنی تنقید کے اصولوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ یہ ڈپلوما آرکائیو کی ملازمت میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

شعبے میں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اردو سیکھنے والوں کی درخواستیں آتی ہیں۔ ان میں وکلا، دیگر زبانوں کے اساتذہ، اسٹیج کے اداکار، غزل گانے کا شوق رکھنے والوں کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک سے طالب علم ہوتے ہیں۔ تقریباً چار دہائی قبل یہاں روسی اسکالرز کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے وزارت تعلیم کے ایما پر باقاعدہ اساتذہ کا تقرر کیا گیا، بڑی تعداد میں اردو سیکھنے کے لیے یہاں روسی طالب علم آتے تھے۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ایم.اے. کا دو سالہ کورس چار Semesters میں منقسم ہے۔ دو سال میں سو سو نمبر کے سولہ پرچے طلبہ کو پاس کرنے ہوتے ہیں۔ ہر Semester میں ایک لازمی پرچہ متن کا رکھا گیا ہے تاکہ طلبہ متن پڑھنے کے لیے مجبور ہوں، باقی پرچے اختیاری ہوتے ہیں۔ ایم.اے. کے بعد ایم.فل. اٹھارہ ماہ کا کورس ہے جس میں سو سو نمبر کے تین پرچے پاس کرنے کے بعد اسکالر کو تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا ہے، آخر میں زبانی امتحان لیا جاتا ہے۔ ایم.فل. میں داخلے کے لیے ایم.اے. میں 55% فی صد

نمبر ہونا لازمی ہیں۔ ایم فل مکمل کرنے کے بعد اسکالر ph.D میں کسی خاص موضوع کو لے کر رجسٹریشن کراتا ہے جس کی مدت پانچ سال ہوتی ہے۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ تحقیقی، اشاعتی، علمی اور ادبی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کی کوششوں سے شعبے میں باقاعدہ تحقیقات و اشاعت کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جس کے ناظم سید امیر حسن نورانی مقرر ہوئے۔ اردو کے نامور محقق رشید حسن خاں کا تقرر شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا گیا جنھوں نے شعبے کے لیے متعدد تحقیقی اور تدوینی کام انجام دیے۔ اردو کے ممتاز خوش نویس بھی شعبے سے وابستہ رہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے مختلف کتب خانوں سے جو مخطوطات حاصل کیے تھے انھیں شعبے کی جانب سے شائع کرایا۔ شعبۂ اردو کی مطبوعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ 1960 میں شعبے کے ایک ششماہی جریدے کا ''اردوئے معلی'' کے نام سے اجرا ہوا۔ پہلا شمارہ یوم غالب پر ''غالب نمبر'' کی شکل میں آیا۔ اس میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر محمد اشرف، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر گیان چند جین اور شعبے کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے مضامین شامل تھے۔ جلد ہی ''اردوئے معلی'' کا ایک اور غالب نمبر شائع ہوا جس میں دیگر مضامین کے ساتھ ''دستنبو'' کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ ''اردوئے معلی'' سیریز میں بعض اور اہم نمبر بھی شائع ہوئے جن میں لسانیات نمبر، سوز نمبر، قائم نمبر، قدیم اردو نمبر، ترقی پسند ادب نمبر، تنقیدی تصورات، تحقیقی تصورات، تحقیق و تدوین شامل ہیں۔ دستیاب شدہ مخطوطات مثلاً کربل کتھا، تذکرۂ سرور، گنج خوبی، دیوان بقا، خدنگ غدر اور انشائے اردو کو بھی شعبے نے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ''اصول تحقیق و ترتیب متن'' کی پہلی اشاعت شعبۂ اردو سے ہوئی۔ ''اردو میں وہابی تحریک''، ''دہلی اردو اخبار''، ''مرقع دہلی''، اشاریہ کلام غالب''، ''اردو میں لوک ادب''، ''اردو ماس میڈیا''، ''مومن شخصیت اور فن'' جیسی کتابیں بھی شعبے سے شائع ہوئیں۔ شعبۂ اردو میں 1966 میں نظام حیدرآباد کے تعاون سے ''نظام اردو خطبات'' کا آغاز ہوا، جس میں ملک کے نامور دانشوروں نے ادب کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر اردو میں خطبات پیش کیے۔ ان خطبات کو شعبۂ اردو نے کتابی شکل میں بھی پیش کیا۔ ان میں خواجہ غلام السیدین کا ''فکر انسانی کا سفر ارتقا''، خلیق احمد نظامی کا ''اوراق مصور''، ہارون خاں شیروانی کا ''دکنی کلچر''، رشید احمد صدیقی کا ''غالب کی شخصیت اور شاعری''، ممتاز حسین کا ''مارکسی جمالیات''، عبید صدیقی کا ''دماغ کا ارتقا''، حنیف نقوی کا ''غالب کی فارسی مکتوب نگاری'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان خطبات کا انعقاد ہر سال ہوتا ہے۔ نظام خطبات کے تحت جن دیگر دانشوروں اور مورخین نے خطبات پیش کیے ہیں ان میں ڈاکٹر تاراچند، آنند نرائن ملا، پروفیسر محمد حبیب، ظفر احمد صدیقی، پروفیسر رئیس احمد، علی سردار جعفری، پروفیسر نسیم انصاری، علی محمد خسرو، سید ظہور قاسم، پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر عرفان حبیب، سید حامد، حبیب تنویر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مشیر الحسن، پروفیسر محمد شفیع کے نام بھی شامل ہیں۔ ان خطبات کی نوعیت علمی اور ادبی ہوتی ہے۔ ان کا موضوع تاریخ، جغرافیہ، سائنس، طب و فلسفہ اور اردو زبان و ادب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی تحقیق کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایم فل. اور پی. ایچ. ڈی. کے لیے گذشتہ پچاس سال میں متعدد مقالے لکھے گئے ہیں۔ یوں تو ایم فل. کی جو پہلے ایم لٹ کہا جاتا تھا، مدت اٹھارہ مہینے ہے لیکن طالب علم کو مقالہ لکھنے کے لیے صرف آٹھ دس مہینے مل پاتے ہیں۔ اس لیے کوئی ایسا موضوع منتخب کیا جاتا ہے جس پر اس مدت میں مقالہ تیار ہوجائے۔ گذشتہ تیس سالوں میں تقریباً دو سو پچاس مقالے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان میں تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ادبا و شعرا کی حیات و خدمات پر مقالات لکھے گئے ہیں، کتابوں کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے، فرہنگ سازی کا کام ہوا ہے۔ اشاریے اور وضاحتی فہرستیں تیار کی گئی ہیں اور ناولوں اور شعری مجموعوں کا تنقیدی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ کچھ موضوعات حسب ذیل ہیں۔ ناصر نذیر فراق کی ادبی خدمات، جذبی اور ان کی شاعری، سید احمد دہلوی حیات اور خدمات، میر مہدی مجروح، قاضی عبدالغفار کی ادبی خدمات، شاہد احمد دہلوی، حجاب امتیاز علی حیات اور ادبی کارنامے، قصہ مہر افروز و دلبر کا تنقیدی مطالعہ، عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ، نقوش اقبال کا تنقیدی تجزیہ، عالم انتخاب ایک تنقیدی مطالعہ، شعر شور انگیز کا تنقیدی مطالعہ۔ ایم فل. کے مقالات کے لیے جو فرہنگیں اشاریے اور وضاحتی فہرستیں تیار کی گئی ہیں ان میں بوستان خیال کی تہذیبی فرہنگ، فسانۂ آزاد کی تہذیبی فرہنگ، قصائد سودا کی فرہنگ، کلام میر دیوان اول کی فرہنگ، اردو فکشن کی وضاحتی کتابیات، رسالہ دل گداز کا اشاریہ، اقبالیات: وضاحتی کتابیات، پریم چند کے ناولوں کے کردار: ایک وضاحتی اشاریہ، شرر کے تاریخی ناولوں کے کرداروں کا وضاحتی اشاریہ، مرزا رسوا کے ناولوں کے کرداروں کا توضیحی اشاریہ شامل ہیں۔ اتنی کم مدت میں کام کرنے کے لیے اسکالر سے کسی ناول یا شعری مجموعے کا تنقیدی مطالعہ بھی کرایا جاتا ہے مثال کے طور پر گھروندہ کا تنقیدی مطالعہ، ٹیڑھی لکیر کا تنقیدی مطالعہ، گریز کا تنقیدی مطالعہ، فردوس بریں کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ، شعلۂ وشبنم کا تنقیدی تجزیہ، بال جبریل کی امیجری، ضرب کلیم کی پیکر تراشی۔

تحقیق اور تدوین متن کے مشکل کاموں سے طالب علم عموماً بچنا چاہتے ہیں اس لیے کہ طالب علموں کی اکثریت میں سنجیدگی اور تحقیقی صلاحیت کا فقدان ہے۔ اسی لیے دہلی یونیورسٹی نے حال ہی میں پی. ایچ. ڈی. کے داخلوں کے ضوابط میں نمایاں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایم فل. اور پی. ایچ. ڈی. کے اسکالرز کے لیے ماہانہ وظائف مقرر کیے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے تقریباً ایک سو بیس اسکالر

پی.ایچ.ڈی. کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے اسکالر بھی شامل ہیں جن کی خدمات کو اردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا مثلاً گوپی چند نارنگ، ظہیر احمد صدیقی، خلیق انجم، نورالحسن نقوی، عنوان چشتی، مغیث الدین فریدی، اسلم پرویز، عتیق احمد صدیقی، نعیم احمد، حنیف کیفی وغیرہ۔

گذشتہ پچاس سال میں لکھے گئے تحقیقی مقالات پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ تقریباً ہر طرح کے موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شخصیات کے علاوہ دواوین کی تدوین کا کام بھی ہوا ہے، تنقیدی مطالعہ، شعری نظریات و تصورات، ادبی ولسانی اور تہذیبی جائزے، مختلف اصناف کی ارتقائی تاریخ کو بھی تحقیقی مقالات کا موضوع بنایا گیا ہے۔

شعبے میں جن اہم شخصیات پر مقالات قلمبند کیے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1. مومن دہلوی، ظہیر احمد صدیقی
2. مرزا مظہر جان جاناں، خلیق انجم
3. بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز
4. مصحفی، نورالحسن نقوی
5. اسمٰعیل میرٹھی، سیفی پریمی
6. شیفتہ، صلاح الدین خاں
7. عبدالحلیم شرر، شریف احمد
8. محمد علی طیب، عبدالحیٔ
9. ملا وجہی، جاوید وششٹ
10. میر امن، نفیس جہاں بیگم

کچھ برسوں سے دہلی یونیورسٹی میں حیات اور خدمات پر تحقیقی مقالات لکھنے کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کلام کا تنقیدی مطالعہ ہونے لگا ہے۔ چند موضوعات جن پر مقالات لکھے جاچکے ہیں اس طرح ہیں: جرأت کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، جوش ملیح آبادی کی امیجری کا تنقیدی مطالعہ، فکر اقبال کا تنقیدی مطالعہ، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، راجندر سنگھ بیدی کے فن کا تنقیدی جائزہ، عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ، سرشار کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ۔ شعبے میں میر اثر، ممنون اور یقین کے کلام کو مدون بھی کیا گیا ہے۔ مختلف شعری اور نثری اصناف کے تاریخی ارتقا پر بھی شعبۂ اردو میں تحقیقی مقالات قلمبند ہوئے ہیں جیسے اردو ناول کا آغاز و ارتقا، اردو میں شہر آشوب، اردو نثر کا ارتقا، اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، اردو مختصر افسانہ، اردو ڈراما نگاروں کا تذکرہ۔

شاعری اور نثر میں مختلف نظریات، تصورات اور تہذیبی و سماجی عناصر کی تلاش بھی تحقیق کا خاص موضوع رہا ہے۔ مثلاً اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر، اردو شاعری میں قومیت کا تصور، بوستان خیال کا تہذیبی اور لسانی مطالعہ، اردو افسانے کا سماجی مطالعہ، اردو غزل کے تہذیبی تناظر۔

شعبۂ اردو کے تحقیقی مقالوں کے موضوعات کو علاقائیت کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا گیا ہے مثلاً میسور میں اردو کی نشوونما، دہلی میں اردو افسانہ، جونپور کی ادبی خدمات، دہلی میں طنز و مزاح کا ارتقا، اردو افسانے کے فروغ میں علی گڑھ کا حصہ وغیرہ۔

فی الوقت بھی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں متعدد اسکالر تحقیقی مقالے لکھنے میں مصروف ہیں۔ دہلی میں اس وقت تین ایسی مرکزی یونیورسٹیاں ہیں جن میں شعبۂ اردو قائم ہیں اور جہاں اردو کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، تینوں جامعات میں بڑی تعداد میں مختلف کورسوں میں طالب علم موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً تینوں جگہ ادبی اور کلچرل تقریبات کا انعقاد ہوتا رہتا ہے، تینوں جامعات کے اکثر اساتذہ اردو کے ادیب یا شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں اردو اساتذہ کی تعداد اس لیے سب سے زیادہ ہے کہ یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں کے اساتذہ بھی یونیورسٹی کا ہی حصہ ہیں۔ شعبۂ اردو سے جو اساتذہ مستقل طور پر وابستہ رہے اور یہیں سے سبکدوش ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر شمیم نکہت، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، پروفیسر صادق، ڈاکٹر فرحت فاطمہ، ڈاکٹر عابدہ بیگم اور ڈاکٹر عبدالحیٔ۔ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی کچھ مدت تک شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ موجودہ اساتذہ میں ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر محمد کاظم شامل ہیں۔ ملحقہ کالجوں میں تدریسی فرائض انجام دینے والوں میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جاوید وششٹ، ڈاکٹر اسلم پرویز، سید ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر محمد فیروز، ڈاکٹر شہاب جعفری، ڈاکٹر کامل قریشی کے نام شامل ہیں۔ غیر تدریسی عملے میں رشید حسن خاں، امیر حسن نورانی، ڈاکٹر شرافت حسین مرزا، یعقوب عامر، ضیاء احمد بدایونی، ترلوک چند شاستری اور شکیب نیازی کے نام قابل ذکر ہیں۔

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اپنی تحقیقی، علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک فعال اور متحرک شعبہ رہا ہے۔ اس میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے علاوہ طالب علموں کی اصلاح و تربیت بھی کی جاتی ہے۔ طالب علموں کی انجمن ''بزم ادب'' کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک ادبی نشست ہوتی ہے جس میں طالب علم اپنے مقالات پڑھتے ہیں اور ان پر بحث ہوتی ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi-110007

محمد اعجاز

روزگار کی تلاش کے جدید طریقے

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج نوکری کے بازار میں الگ الگ نوعیت کی ہزاروں نوکریاں ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ کو اس دوڑ میں پچھڑنا نہیں ہے تو اپنے وقت، صلاحیت اور قابلیت کے ساتھ نوکری تلاش کرنے کے طریقے کو بدلنا ہوگا۔

ویب سائٹ کے ذریعے

آن لائن نوکری تلاش کرنا اب صرف بڑے شہروں تک محدود نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دس میں سے چار جاب ملک کے ٹاپ میٹرو شہروں کے ہیں جبکہ باقی چھوٹے شہروں یا گاؤں میں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 61 فیصد آن لائن جاب کے متلاشی چھوٹے شہروں کے ہیں۔ ہندوستان میں سرگرم اہم آن لائن جاب سائٹس کا دعویٰ ہے کہ وہ بہ یک وقت ایک لاکھ سے زیادہ نوکریوں کی جانکاری دیتی ہیں۔ مہینے بھر کا حساب لگایا جائے تو یہ تعداد ایک سو ملین یا اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہے ان ویب سائٹ کی پہنچ کا عالم گیر ہونا۔ یعنی نوکری چاہے نئی دہلی میں ہو یا نیویارک میں جاب ویب سائٹ کی بدولت آپ کو اس کی جانکاری گھر بیٹھے مل جائے گی۔ نوکری یا کیریئر کے لیے رہنمائی ویب سائٹس کی ممبری، روزگار، تعلیم کے بارے میں ساری معلومات بس ایک کلک کی دوری پر ہے۔ اگر آپ ان سائٹس کے ممبر ہیں تو دو منٹ کے اندر آپ نوکری کے لیے درخواست پیش کرسکتے ہیں اور آپ کی درخواست بحالی کرنے والے کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ دوسری جانب اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ نوکری کھوجنے والے کے ساتھ ہی نوکری کا اشتہار دینے والی کمپنیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ تاکہ بحالی کرنے والوں کو بھی امیدواروں کا غیر ضروری انتظار نہ کرنا پڑے۔

موبائل کے ذریعے

موبائل فون ہمیشہ صارف کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ جاب کھوجنے کے اس نئے وسیلے کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اس لیے اگر آپ کو نوکری کی تجویز موبائل پر بھیجے گئے ایس ایم ایس پر ملے تو تعجب نہ کیجیے گا۔ نوکری ڈاٹ کام کے بعد دوسری ویب سائٹس بھی اس شعبے میں قدم رکھ رہی ہیں، جس کی بدولت آج نوکری کھوجنے والے موبائل فون کے ذریعے اپنی کھوج جاری رکھ سکیں گے۔ وہیں مالک مناسب امیدوار سے ایس ایم ایس کے ذریعے رابطہ کرسکے گا۔ اس سہولت کی بدولت ان لاکھوں لوگوں تک پہنچا جاسکتا ہے جن کے پاس انٹرنیٹ سے جڑنے کا وقت نہیں ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس کا مستقبل انٹرنیٹ سے بھی زیادہ تابناک ہے موبائل فون ہمیشہ صارف کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

پلیسمنٹ ایجنسی کے ذریعے

پلیسمنٹ ایجنسی لوگوں کے لیے نوکری یا نوکری کے لیے لوگوں کو کھوجنے کا کام کرتی ہے۔ پلیسمنٹ فیس یا تو نوکری کھوجنے والے سے یا مالک سے لی جاتی ہے۔ اس کا طریقۂ کار مالک اور نوکری چاہنے والوں کی مانگ پر منحصر ہے۔ یہ ایجنسیاں کمپنیوں سے رابطہ کرتی ہیں تاکہ نوکریوں سے متعلق جانکاریاں حاصل کرسکیں۔ اس کے بعد ایجنسیاں قابل امیدواروں کو چھانٹ کر ممکنہ مالکوں تک پہنچاتی ہیں۔

نیٹ ورکنگ

نوکری کھوجنے کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے نیٹ ورک۔ کیریئر کے ماہرین کہتے ہیں کہ کیریئر کا انتخاب کرتے وقت اور روزگار تلاش کرتے وقت نیٹ ورکنگ سب سے اہم کام ہے۔ اس لیے جس شعبے میں بھی آپ نوکری تلاش کرنا چاہتے ہیں، اس شعبے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بات کیجیے۔ کسی پروفیشنل آرگنائزیشن سے وابستگی ساتھ ہی ان روابط کا استعمال کرنا جو آپ نے برسوں میں پروان چڑھائے ہیں، نیٹ ورکنگ کی شکل ہے، بیرونی ممالک کے طرز پر بھارت میں بھی نیٹ ورکنگ ادارے فروغ پارہے ہیں جیسے نیشنل ایچ آر ڈی نیٹ ورک یا آل انڈیا مینجمنٹ ایسوسی ایٹ جو اپنے شعبے سے وابستہ مسائل کو لے کر آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ایسے اداروں کی شاخیں کئی شہروں میں ہوتی ہیں۔ آن لائن بزنس نیٹ ورک اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ کالج میٹ نیٹ ورکنگ کا ہی حصہ ہے جہاں بیچ میٹ یا سینئر ملتے ہیں اور آپس میں رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ ایکروٹمنٹ کنسلٹنٹ بھی نیٹ ورکنگ کی ہی کئی شکل ہے جس کا بھرپور استعمال ہو رہا ہے۔

جاب فیئر

ملک بھر میں الگ الگ شہروں میں منعقد ہونے والے روزگار میلوں نے بھی روزگار کی تلاش کو آسان بنا دیا ہے۔ جاب فیئر کی بدولت نوکریاں حاصل

کرنے والوں کو ٹاپ کمپنیوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے اور انھیں ایک ہی پلیٹ فارم پر جاب آفر کے ساتھ ساتھ نوکری سے متعلق مشورہ بھی مل جاتا ہے۔
ان دنوں زیادہ سے زیادہ نوجوان روزگار میلوں میں حصہ لیتے ہیں اور ان میلوں کا انعقاد ان کے کیریئر کو صحیح رخ دینے میں معاون ہوتا ہے۔ جاب فیئر ریکروٹمنٹ کی یہ تکنیک تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

کچھ اہم ویب سائٹس:

www.career1000.com
www.indianairfoce.nic.in
www.itplacement.com
www.edgeindia.com
www.journetmart.com
www.placementindia.com
www.monster.com
www.surf4jobs.com
www.winijobs.com
www.recrutmentindia.com
www.employmentindia.com
www.itpeople.com
www.3p-j06search.com
www.computerjob.com
www.naukari.com
www.udyog.com

□□□

پتہ:
S/o Abdul Waris
Raja Tola, Harlakhi,
Madhubani, Bihar - 847225

ہند ایرانی ادبیات

مصنف: کبیر احمد جائسی

پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اپنی اس کتاب ''ہند ایرانی ادبیات'' میں ہندوستان اور ایران کے مشترکہ ادبی سرمائے کے چند پہلوؤں پر اپنے مطالعے کا حاصل پیش کیا ہے۔ یہ مطالعے گیارہ موضوعات — بیدل شخصیت اور ماحول، خیام: از سید سلیمان ندوی پر ایک نظر، ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر، دیوانِ حافظِ ہندی، تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ، انشائے مومن پر ایک نظر، ہزارۂ اوّل ہجری میں ایران کی فارسی تفسیر نویسی، جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط، گلستاں کا باب پنجم، ایران میں آذری زبان کا مسئلہ اور ایران میری نظر میں، پر مشتمل ہیں۔

صفحات: 190، قیمت -/250 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نور اللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے دیکھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 190، قیمت -/250 روپے

ممتاز عالم رضوی

روبرو

شوکت حیات سے ایک ملاقات

1970 کے بعد سامنے آنے والی نسل میں شوکت حیات کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانے کے ارتقا اور فروغ میں اہم کردار نبھایا ہے۔ شوکت حیات کی پہلی پہچان ان کی افسانہ نگاری ہے لیکن وہ تنقیدی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اچھے مقرر بھی ہیں۔

1997 میں شوکت حیات کو ''گنبد کے کبوتر'' کے لیے ''کتھا ایوارڈ'' تفویض کیا گیا اور ان کی اس کہانی کا ترجمہ بعنوان "Pigeons of the Dome" پریم چند کی پوتی اور مشہور اسکالر سارا رائے نے کیا۔ ابھی چند ماہ قبل انھیں بہار اردو اکادمی کے ''لائف اچیومنٹ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ شوکت حیات گذشتہ ڈیڑھ سال سے بیمار ہیں بہ سلسلۂ علاج وہ دہلی آئے تو خاکسار نے ان سے ملاقات کی اور انٹرویو لیا۔ قارئین ''اردو دنیا'' سے اپیل ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ شوکت حیات سے جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ ذیل میں پیش ہے۔

ممتاز عالم رضوی: آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیوں کیا؟

شوکت حیات: اگر میں اس کی تفصیل میں جاؤں گا تو ظاہر ہے کہ بات کہیں سے کہیں تک جا پہنچے گی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے والد سید محفوظ الحسن مطالعے کے بڑے شوقین تھے۔ ان کے کمرے میں اس زمانے کے تمام فکشن لکھنے والوں کی کتابیں جمع تھیں۔ بچپن میں میں ان کے کمرے کی لائبریری کا چور reader ہوا کرتا تھا۔ یہ بھید کھلنے پر کہ میں نصاب کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے مشہور افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی پڑھ رہا ہوں، ڈانٹ پڑی تھی۔ شاید مار بھی کھائی ہو۔ ٹھیک سے یاد نہیں — لیکن ایک بار والد صاحب کے ساتھ دہلی جاتے ہوئے والد نے مجھے ایک ڈائری تھما دی اور مجھے پٹنہ سے نئی دہلی کے درمیان آنے والے تمام اسٹیشنوں اور خاص تجربات و مشاہدات کا احوال لکھنے کی ہدایت کی۔ پھر یہ ہدایت بھی کہ جو اچھا لگے، یہ لکھیں کہ کیوں اچھا لگا۔ اور جو خراب لگے، اس کے بارے میں لکھیں کہ کیوں خراب لگا۔ میں والد کی طرف سے دی گئی ڈائری میں اپنے مشاہدات اور تجربات لکھنے لگا اور کیوں؟ کا بیان بھی کرنے لگا۔ بعد میں ان کے انتقال کے بعد مجھے افسانہ نگاری کی طرف راغب کرنے میں ڈائری لکھنے کی عادت کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ بچپن میں شفیق والد کے انتقال نے بڑی اولاد ہونے کے ناتے مجھے ذہنی طور پر اس دنیا اور اپنے وجود سے آزردہ کر دیا۔ چھ بھائی بہنوں کی ذمے داریوں نے بچپن میں ہی مجھے بوڑھا بنا دیا۔

والد کی طرف سے ذہن میں بیٹھائے گئے کیوں نے دنیا کے اسرار و رموز اور اس کی بنیاد کی طرف قدم بڑھانے کو مجبور کیا تو اپنے مشاہدات اور محسوسات کے اظہار کے لیے افسانے کی صنف مجھے سب سے زیادہ موزوں لگی۔ میں اپنی اداسیوں اور زندگی کے تئیں بیزاری کی وجہ سمجھنا چاہتا تھا۔ گوتم بدھ کی طرح نروان کی طرف بڑھا تو راستے میں یہ صنف میرے ہمراہ ہوگئی۔ آج کی مایوس کن، بتدل پذیر، پیچیدہ اور تہہ در تہہ زندگی کے اظہار کے لیے یہ صنف مجھے موزوں ترین معلوم ہوئی۔ چنانچہ 1965 سے میں کہانی لکھنے لگا۔ والد کے انتقال کے فوراً بعد یا میری شخصیت اور میری زندگی میں جو اچانک خلا پیدا ہوا اسے بھرنے کے لیے جس تیز رفتاری سے افسانہ نگاری کی ہوا میرے قریب آئی، کوئی دوسری صنف نہ آسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے رف اور لف ہونے کے احوال کا بیان کہانی کے سوا کسی اور صنف میں ممکن بھی نہیں والد کی ہدایت کے زیر اثر کیوں؟ کے ساتھ کیا اور کیسے کے لوازمات بھی شامل ہو گئے۔ اور کیوں کیسے اور کیا جیسے سوالات اچھے تخلیق کار کو ریلی ونٹ افسانہ نگار بناتے ہیں ایسا میرا ماننا ہے۔

ممتاز عالم رضوی: آپ کس افسانہ نگار سے زیادہ متاثر ہوئے؟

شوکت حیات: والد صاحب کی گھریلو لائبریری میں (جو بعد میں امی جان کے نام پر قمر النسا لائبریری میں تبدیل ہوگئی) سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی وغیرہ موجود تھے جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن سائنس کالج میں داخل ہونے کے بعد بنگالی دوستوں کے ذریعے جب کامیو، سارترے، موپاساں، چیخوف، گوگول، خلیل جبران وغیرہ جیسے دیگر زبانوں کے مصنفین کو پڑھنا شروع کیا، ساتھ ساتھ مارکس لینن، فرائڈ، یونگ، لوبیا وغیرہ کو بھی پڑھا تو مجھے خلیل جبران، سارترے اور کامیو نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ سارترے کی وجودیت نے والد کے کسی اور دنیا میں چلے جانے کے دکھ کو کم کیا۔ اس سے پہلے بچپن میں مجھے کئی سالوں تک لگتا رہا کہ مرحوم والد اچانک آئیں گے اور پوچھیں گے:

''بیٹا آپ نے ڈائری لکھنا بند تو نہیں کیا۔''

سارترے وغیرہ نے زندگی پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ممتاز عالم رضوی: آپ کو کن افسانوں سے شہرت ملی؟

شوکت حیات: ویسے تو 1965 سے میں بچوں کے لیے لکھنے لگا تھا۔ اس زمانے کے بچوں کے رسائل نور (رامپور)، کھلونا (دہلی)، مسرت (پٹنہ) میں بہت شائع ہوا۔ لیکن بعدازاں غیاث احمد گدی، احمد یوسف، مظہر امام، سلطان اختر، ظفر اوگانوی، شمیم فاروقی، ظہیر صدیقی، ارمان نجمی کے یہ احساس دلانے پر کہ یہ چادریں میرے گہرے استغراق اور فکری گہرائیوں کے اظہار کے لیے چھوٹی پڑ رہی ہیں۔ 1970 سے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ پہلی کہانی ''بکسوں سے دبا آدمی'' کتاب لکھنؤ جیسے معیاری رسالے میں چھپنے اور مدیر عابد سہیل کے ہمت افزائی کرنے کے بعد باضابطہ بڑوں کے لیے لکھنے لگا۔ کلام حیدری نے ''آہنگ'' میں خصوصی گوشہ چھاپا۔ اس زمانے کی دو کہانیوں ''تین مینڈک'' اور ''بانگ'' مجھے اہم افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مہدی جعفر، حامدی کاشمیری، نظام صدیقی اور کئی اہم ناقدین نے میری کہانی ''بانگ'' کو اردو افسانے کا Turning point قرار دیا۔ کیوں کہ اس کہانی میں ادبی و فنی گہرائی کے ساتھ ساتھ میں نے بڑے بھائیوں کے ہاتھوں افسانے کے گم کردہ عناصر تجسس واشتیاق اور کہانی پن کی مسماری کے برخلاف بھرپور کہانی پن اور نفسیاتی نظام کی استواری کو بطور خاص اپنے عصری میلان اور عصری تقاضوں کے تحت بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں مجھے کوبڑ، پھینڈا، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، بلی کا بچہ، گنبد کے کبوتر، مسٹر گلیڈ، شکنجہ، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، رانی باغ، جیسی کہانیوں سے مزید شہرت اور مقبولیت ملتی رہی۔ میرے قاریوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ ''شوکت حیات فینس ایسوسی ایشن'' جیسی تنظیم کی بنیاد بھی پڑی۔ ایم ٹی خاں، پروفیسر سید شوکت علی، پروفیسر اروند، کامریڈ انیتا اروند، ڈاکٹر مظفر، سید نہال اشرف، جاوید حیات، خورشید حیات وغیرہ اس کے ارکان ہیں۔

''گنبد کے کبوتر'' نے نہ صرف قومی کتھا ایوارڈ سے مجھے سرفراز کیا بلکہ یہ باور بھی کرایا کہ آپ بیتی جب فنی نقطۂ نظر اور تخلیقی موقف کے ساتھ جگ بیتی بنتی ہے تو وہ کہانی اپنے عصر سے زیادہ آفاقی حقیقتوں اور ازلی زندگی کی نامیاتی قوتوں سے متصف ہو جاتی ہے اور عہد بہ عہد زندہ رہنے کی تخلیقی قوت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کہانی کے بارے میں مہدی جعفر نے لکھا کہ بابری مسجد پر کچھ اور نہ بھی لکھا جاتا تو اکیلی شوکت حیات کی یہ کہانی اس تاریخی سانحے کے Pathos کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اب خود میں ''گنبد کے کبوتر'' کو پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ کیا اتنے تہہ در تہہ علامتی انداز میں زندگی کو اس کے ازلی اور عصری امتیازات کے امتزاج کے ساتھ پیش کرنا ممکن ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ اگر میرا دوسرا جنم ممکن ہو اور مسجد دوبارہ مسمار کی جائے تو میں خود ایسی شاہکار لکھ پاؤں۔ سچ پوچھیے تو اس وقت کے میرے سکتے اور گونگے پن نے مجھے اس کہانی کے ذریعے قوت گویائی دی۔ ''رانی باغ''، ''شبت''، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ''، ''گھونسلا''، ''کوبڑ'' اور ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' نے بھی میری شہرت اور اس کی استقامت کو لگاتار بڑھانے میں میری مدد کی۔

ممتاز عالم رضوی: آپ اپنے کرداروں کے سلسلے میں کیا کہیں گے؟

شوکت حیات: یوں تو میں مانتا ہوں کہ یہ عہد کردار مرکوز افسانے لکھنے کا نہیں ہے کیوں کہ پوری سچویشن ہمیں Haunk کرتی ہے اور حالات کی سفاکی، ہیبت ناکی اور ہولناکی نے کرداروں کی جگہ لے لی ہے۔ ہر چہرہ کٹا پھٹا اور آدھا ادھورا۔ فی زمانہ کرداروں کی integrity اور ان کا وجود غیر معتبر بن چکے ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ ایسی ذلیل ترین سیاسی اور سماجی صورت حال سے دوچار ہے کہ ہمیں قدامت پسندوں اور ترقی پسندوں کے افسانوں کی طرح بھرپور اور مکمل کردار دکھائی نہیں دیتے۔ انسانیت اور انسانی آبادی ادھورے پن اور پیچیدگیوں میں گھر کر رہ گئی ہے۔ ہر کردار اپنے سچویشن پر Obsession میں گرفتار دکھائی دیتا ہے اور depression سے دوچار ہے۔ چنانچہ بطور خاص میں نے سچویشن سیریز کی کہانیاں لکھیں جہاں آج کے عہد کے Paradox کو Inprovise کرتے ہوئے قاری کے سامنے عصری اور آفاقی تقاضوں کو بروئے کار لانے کا عمل اور منظرنامہ دکھائی دیتا ہے۔

مجھے باضابطہ کرداروں کے گم ہو جانے اور سچویشن کی اسیری میں جکڑے ہوئے انسانوں کے احوال بیان کرنے کے جواز کے پیمانوں نے نہ صرف چھ سچویشن سیریز کے افسانے لکھنے پر مجبور کیا جو شب خون، اظہار، نشانات، تحریک جیسے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے بلکہ سچویشن نمبر 6 کے ساتھ ''سچویشن سیریز کیوں؟؟ جیسا مضمون بھی جواز (مالیگاؤں) جیسے اہم رسالے کے خاص نمبر میں شائع کرایا۔ نئے تخلیقی منطقوں کی دریافت و بازیافت کی طرف سچویشن سیریز کی کہانیوں کو عصری عہد کا شناخت نامہ قرار دیا گیا۔

ویسے میں نے رحمت صاحب، مُخی، عبدالمنان، مسٹر گلیڈ، گنبد کے کبوتر، کے سین دادا، ریزہ اور مسٹر تھامسن جیسے کرداروں کی کئی کردار نگاری بھی ہے، مُخی جیسے کردار میری کئی کہانیوں مثلاً ''موم بتی پر رکھی ہتھیلی''، ''بے گھری''، ''تین مسافر'' میں بار بار در آئے ہیں جو دراصل چارو مجمدار، بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں اور پیر علی جیسے کرداروں کے استعارے کے طور پر ابھرے ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر یہ مانتا ہوں کہ یہ عہد کرداروں کا نہیں بلکہ ان کی گمشدگی کا ہے۔ اور ان کو گم کرنے والا آج کا گلوبل بازارواد، استحصالی نظام اور فاشسٹ تحریکیں ہیں جنھوں نے کردار کے وجود کو مسمار کر دیا ہے۔ لہٰذا آج کے کردار حالات

کے جبر اور ہولناکیوں میں اپنے دبے کچلے وجود کو کھولتے چلے جارہے ہیں۔ ویسے میرے افسانوں میں طبقاتی افسانوں کے چہروں کے نقوش واضح ہوتے ہیں جنھیں بڑے بھائیوں نے گم کر دیا تھا۔

ممتاز عالم رضوی: آپ ہم عصر ناقدوں کے رویے سے مطمئن ہیں یا نہیں؟

شوکت حیات: ناقدوں کا کام ہوتا ہے کہ فن کار کی تخلیق کی پرتوں کو کریدیں اور قاری اور فن پارے کے درمیان پل کا کام کریں۔ لیکن آج کے بیش تر ناقدین تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈنڈے اور چابک گھماتے ہوئے نظر آتے ہیں پھر بھی کچھ ناقدین غنیمت ہیں کہ یہ تخلیقات کی اولیت کے قائل ہیں اور تخلیقات کے اندر سے ان کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے خود اس فن کار اور فن پارے کے بطن سے پیدا ہونے والے تاثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر ناقدوں نے فن پارے کے تئیں فتوے صادر کرنے والے کٹر مولوی اور پنڈت کا رویہ اختیار کر رکھا ہے جو مجھے سخت ناپسند ہے۔

ممتاز عالم رضوی: معاصر افسانہ نگار کے ہاں کیا چیز ہے جو آپ کو زیادہ متوجہ کرتی ہے؟

شوکت حیات: مجھے ایسے ہی معاصر افسانہ نگار متوجہ کرتے ہیں جو عصریت سے آفاقیت کے امتزاج اور انجذاب کے ساتھ ذات و کائنات، فرد اور سماج کی ہم آہنگی سے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس زندگی کا رشتہ ازلی زندگی کے ساتھ قائم کرتے ہیں— ظاہر ہے ایسے معاصر افسانہ نگار کم ہیں۔

ممتاز عالم رضوی: آج کے افسانے بڑے کردار نہیں دے پارہے ہیں ایسا کہا جاتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

شوکت حیات: آج صورت حال یہ ہے کہ ہر آدمی ......وقت کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے اور اصلی آدمی اور کردار ان نقابوں کے پیچھے گھٹتا ہوا مر رہا ہے بلکہ شاید غائب ہو چکا ہے۔ ادیب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور زندگی مسلسل بدلتی چلی جارہی ہے۔ خیر و شر کی لڑائی جاری ہے اور خیر کی لڑائی لڑنے والا نام نہاد سیاست داں خود بہت بڑے شر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ انگریز جتنی دولت ہندوستان سے بٹور کر لے گئے اس سے زیادہ دولت ہمارے سیاست دانوں اور سیٹھوں کے غیر ملکی بینکوں میں پڑی ہوئی ہے۔ پریم چند کا اندیشہ صحیح ثابت ہوگیا کہ انگریز چلے جائیں گے لیکن دیسی اور کالے انگریز رہ جائیں گے اور بدیسی انگریزوں سے زیادہ اس ملک کے عوام کا خون نچوڑ دیں گے۔ آپ غور کریں کہ ایسے حالات میں بڑے کردار کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔

ممتاز عالم رضوی: ادب میں آپ نے انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی پر بڑا زور دیا ہے، ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

شوکت حیات: جی ہاں ضرور بتاؤں گا۔ جب 1970 میں میرے افسانوں کے شعور کی آنکھیں کھلیں تو اس زمانے میں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کا زور کم ہو رہا تھا۔ ہمیں ترقی پسند حضرات ترقی پسندی کے لیبل کے ساتھ اور جدید حضرات جدیدیت پسندی کے لیبل سے برانڈ کرنا چاہ رہے تھے۔ 1970 والوں کی اور خود اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے لیے میں نے ان دونوں کو مسترد کرنے کا اعلان کیا۔ اپنی اور اپنی نسل کی شناخت کے لیے کوئی مناسب نام نہ سوجھنے پر namelessness جیسی تھیوری کی تجویز پیش کی جسے میری نسل کے تقریباً تمام دوستوں نے پسند کیا۔ یعنی ہمیں نہ ترقی پسند سمجھو، نہ جدید۔ بلکہ ہم ماقبل کے تمام افسانہ نگاروں اور افسانوی تاریخ کو آگے بڑھانے والے وہ ہراول دستے ہیں جو پہلے والوں سے مختلف ہیں۔ اس تعلق سے میں دو بار ''کتاب نما'' (دہلی) کا مہمان اداریہ اور دیگر مضامین لکھ چکا ہوں۔

بعد ازاں مجھے خیال آیا کہ اپنی اور اپنی نسل کی شناخت ہی اہم نہیں بلکہ افسانوں کے استحکام اور ان کی سرمدیت کی اہمیت ہے۔ ہر عہد میں اچھے اور بڑے فن پارے ہوتے ہیں۔ تو گویا بڑے فن پاروں کی شناخت کے لیے میں نے ''انامیت پسندی'' کی تھیوری دی۔ یعنی افسانے میں ''قوت نامیہ'' کو ناگزیر بتایا اور اس پر زور دیا کہ ہر عہد کی وہی کہانی زندہ رہ سکتی ہے جس میں قوت نامیہ کا بنیادی جوہر ہو۔ لہٰذا آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار علی محمود (جو بہاری تھے) سے لے کر موجودہ زمانے کے تخلیق کاروں نے بعض ایسی عمدہ کہانیاں لکھ دی ہیں جو عہد بہ عہد grow کر رہی ہیں اور انھیں ہر عہد میں relevent بناتی ہیں۔

ابھی کچھ سال قبل سارک رائٹرس کانفرنس میں مجھے مدعو کیا گیا اور اس بات کی آزادی دی گئی کہ میں افسانے کے کسی بھی پہلو پر لکھوں تو میں نے ''امکانیت پسندی'' کی تھیوری پر مبنی مقالہ لکھا جو تمام مندوبین نے پسند کیا۔ پاکستان کے انتظار حسین، رشید امجد اور مرزا حامد بیگ وغیرہ موجود تھے۔ قاضی عبدالستار اور اقبال مجید وغیرہ بھی تھے۔ مرزا حامد بیگ میری تھیوری سن کر اچھل پڑے اور انھوں نے میرا گال چھوتے ہوئے کہا ''یار تم نے کیا بات پیدا کی ہے، ہم لوگوں نے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا''

''امکانیت پسندی'' دراصل حقیقتوں کا سینہ چیرنے اور سچویشن میں مداخلت اور نئی گہری حقیقت برآمد کرنے کا عمل جسے آپ CRUX کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح حقیقت کی ایک نئی دنیا آشکار ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے اندر ایک ایسا انکشاف پیدا کرتی ہے جو متبادل اور بہتر نظام حیات کے قیام کے لیے مثبت انداز میں سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔

Probabilities کی دنیا دراصل ہمارے تخلیقی افسانے کا نقطۂ عروج ہے جس کے معیار پر پورا اترنا آسان نہیں۔ اس کے لیے گہرے فکری وفنی شعور وادراک، گہرے استغراق اور اپنے حالات ضم ہوجانے کا عمل ناگزیر ہے۔ اتنا بڑا جوکھم آج کے بیش تر افسانہ نگار مول لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آج زیادہ تر لوگ status coist ہیں اور کچھ سوچے سمجھے بغیر کہ افسانے کی روایت کے تسلسل میں اسے کہاں پر stand کرنا چاہیے۔ بس اندھادھند لکھے جارہے ہیں۔ میں اندھادھند لکھے جانے سے شروع سے احتراز کرتا رہا ہوں۔

ممتاز عالم رضوی: آپ نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

شوکت حیات: نئی نسل ہے کہاں۔ ہم ہی لوگ تو نئی نسل ہیں۔ 70 اور 80 کے بعد کے لکھنے والے بھی تو اس نئی صدی میں لکھ رہے ہیں۔ دو سال پہلے الٰہ آباد میں امرکانت نے سجاد ظہیر کانفرنس میں کہا تھا کہ ہندی ادب میں نیا خون نہیں آرہا ہے۔ وہی حال اردو کا ہے۔

میں خود کو اور آنے والی نسل کو (جس کی شبیہ ابھی غیر واضح ہے) اور اپنے دوستوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ہونا چاہیے تبھی ہم افسانہ نگار کے حقیقی منصب سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔

ممتاز عالم رضوی: مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟

شوکت حیات: ویسے تو میں پچھلے ڈیڑھ سال سے بیمار ہوں۔ پٹنہ کے بعض ڈاکٹروں نے مجھے جواب بھی دے دیا ہے۔ دہلی علاج کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔ اگر جانبر ہوگیا تو میں ایک نئی ادبی اور نئی افسانوی تھیوری پر کام کر رہا ہوں۔ کئی طویل افسانے اور تین ناولٹ لکھے ہوئے ہیں جنھیں صیقل کرنا ہے۔ ان کی اشاعت میری پہلی ترجیح ہوگی۔ پھر اگر میرے مالی حالات درست ہوگئے (ہم لوگوں کے ڈیپارٹمنٹ کا کیس سپریم کورٹ میں چل رہا ہے۔ جیت گئے تو بقایاجات کی ادائیگی ہوگی) تو دوسری ترجیح ہوگی کہ ایک رسالہ نکالوں ''نیا راوی'' جو سہیل عظیم آبادی کی یاد میں شائع کیا جائے گا۔ وہ ''راوی'' نکالتے تھے جو خالصتاً افسانوں کا رسالہ تھا۔ اور بھی کئی منصوبے ہیں۔ لیکن ذرا میں مرنے سے تو بچ جاؤں، صحت مند تو ہوجاؤں۔

ممتاز عالم رضوی: ''اردو دنیا'' کی اشاعت سے اردو زبان وادب کو کس حد تک فروغ حاصل ہوا ہے؟

شوکت حیات: ''اردو دنیا'' میرا محبوب رسالہ ہے۔ صرف دس روپے میں جس طرح اردو کے تخلیقی ادب اور زبان کے مسائل اور حالات کی عکاسی یہ رسالہ کررہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حل تلاش کرنے کی کوششیں بھی کررہا ہے۔ لسانی مسائل، مختلف ریاستوں میں اردو کی صورت حال، نوجوانوں کے کیریئر سے متعلق مضامین، ادیبوں سے ملاقات اور انٹرویو، ادبی خبرنامہ، کتابوں پر تبصرے گویا یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو ہر طرح سے ادب، زبان اور تخلیقیت کی بحالی اور مضبوطی کے لیے کوشاں ہے۔ جو ادارہ اسے نکال رہا ہے یعنی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وہ بھی ہمارے کلاسیکی ادب کی اشاعت کم قیمت کی کتابوں کو چھاپ کر کررہا ہے وہ بڑی بات ہے۔

ممتاز عالم رضوی: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ بیمار ہونے کے باوجود آپ نے اتنا وقت دیا۔

شوکت حیات: آپ کا بھی شکریہ کہ بیماری کے obsession میں گم ہوتے ہوئے شوکت حیات کو آپ نے یاد رکھا اور اس کی عیادت کے لیے آئے۔ جس کے بہانے مجھے اپنے دل کی بہت ساری باتیں آپ کے یعنی ''اردو دنیا'' کے سامنے کہنے کا موقع مل گیا۔

❑❑❑

پتہ:
H-3, Batla House, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025

اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

سنسکرت ڈرامائی روایات کی زائیدہ ''اندر سبھا کی روایت'' ایک ایسی روایت ہے جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع کے ساتھ ایک صدی تک اردو ڈرامے پر اپنے اثرات مرتب کیے، پروفیسر محمد شاہد حسین نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ تین باب اور کئی ذیلی ابواب کے تحت انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی روایات، عوامی روایات جیسے رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کٹھ پتلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مجرے، درباری ڈرامے اور پارسی اسٹیج کا ادبی وفنی نقطۂ نظر سے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/140 روپے

ظہیر احمد صدیقی

(ہماری مطبوعات سے)

فانی کی شاعری

فانی 13 ستمبر 1879 کو بلسی (بدایوں) میں پیدا ہوئے۔[1] شاہ عالم کے عہد میں ان کے مورث اعلیٰ اصالت خاں کابل سے آئے اور دربار دہلی سے وابستہ ہوگئے۔ اصالت خاں اور ان کی اولاد کو دربار دہلی سے منصب اور خطابات عطا ہوئے۔ نواب بشارت خاں جو فانی کے پردادا تھے، بدایوں کے گورنر مقرر ہوئے۔ فانی نے جب آنکھ کھولی تو عیش و فراغت کی زندگی تھی۔ انھوں نے ایک مضمون میں اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں لکھا ہے:

''میں 13 ستمبر 1879 کو دنیا میں لایا گیا۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انھیں اور ان کے جانشینوں کو بہت نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کیے جانے کے علاوہ جاگیرات، خطابات، منصب وغیرہ سے سرفراز کیے گئے۔ نواب بشارت خاں میرے پردادا تھے۔ صوبہ بدایوں کے گورنر تھے..... مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے، پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔[2]

فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی اس میں اگرچہ وہ شان و شوکت تو نہیں رہی تھی، پھر بھی ایک آسودہ زندگی بسر کرنے کے لیے حالات سازگار تھے، علیگڑھ سے 1901 میں بی۔اے، 1908 میں ایل.ایل.بی.کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ، بریلی، اٹاوہ، آگرہ اور بدایوں میں وکالت کی مگر مزاج کی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے یہ پیشہ ترک کردیا۔ 1932 میں وکالت ترک کرکے حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں صدر مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ فانی جب حیدرآباد گئے تو شاید ان کو امید تھی کہ وہ نظام کی استادی پر فائز ہوجائیں گے۔ مگر خودداری کا یہ حال تھا کہ اپنی زبان سے اظہار مدعا نہ کرسکے اور صدر مدرس کی جگہ پر قناعت کرنا پڑی۔ کچھ تلون مزاجی، کچھ ملکی اور غیر ملکی کی سیاست، نتیجہ یہ ہوا کہ 1939 میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ یہ زمانہ مالی اور ذہنی مصائب میں گزرا۔ آخر 26 اگست 1941 کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے اور حیدرآباد کی زمین کو ہی اپنی آخری آرام گاہ بنالیا۔

فانی کی سیرت کا سب سے اہم پہلو ان کی خودداری اور اَنا ہے۔ وہ امرا کی محفلوں میں ایک مخلص دوست تو بن کر بیٹھ سکتے تھے مگر شبہ کا مصاحب رہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ صدق جائسی نے لکھا ہے کہ فانی کو جو مواقع میسر ہوئے ان میں وہ اپنے لیے کیا کچھ حاصل نہیں کرسکتے تھے مگر شہزادے کے دربار میں ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ دوسروں کی طرح کاسۂ گدائی لے کر کھڑے ہوں۔ فانی اپنے ایک مضمون میں شاعر کے معیار کا جو پیمانہ قائم کرتے ہیں وہ دراصل خود ان کی اپنی زندگی کا غماز ہے:

''جو شعرا صحیح معنی میں شعرا تھے یا ہیں وہ شعر کو اس کے صحیح درجے سے گرانے کے لیے نہ کسی قیمت سے خریدے جاسکتے ہیں اور نہ کسی قوت سے مرعوب ہوسکتے ہیں۔ وہ ہر مصیبت کو جو اس مسلک کی بدولت ان پر ٹوٹتی ہے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے ہیں اور برداشت کرتے رہیں گے۔''[3]

فانی کے کلام میں بھی ان کی سیرت کی جھلکیاں نظر آجائیں گی:

اک کلمۂ شوق لب پہ لایا نہ گیا
افسانۂ آرزو سنایا نہ گیا
فانی ارنی نہ اپنے منھ سے نکلا
احسان تجلی بھی اٹھایا نہ گیا

فانی کی شخصیت کے دوسرے پہلو اسی ایک خودداری کے گرد گھومتے ہیں۔ دل درد آشنا، تواضع، انکسار، بے لوث محبت، معیار اخلاق پر ان سب کی قدر ہے مگر بازار میں ان کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی نے ''ہماری زبان'' میں فانی کی شخصیت پر جو مضمون لکھا ہے اس میں تحریر کرتے ہیں:

''اگرچہ آخر میں زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں نے بالکل ہی ان کا دل بجھا دیا تھا لیکن وہ ہمیشہ سے افسردہ طبیعت نہ تھے۔ بلکہ شروع میں خاصے خوش طبع اور ظریف مزاج تھے۔ گھر میں بھائی بہن اگر خاموش یا اداس ہوتے تو ان سے کہتے، تم لوگ ہنسی خوشی رہا کرو۔ مجھے روتی صورت بری معلوم ہوتی ہے۔

کلیات فانی سے ماخوذ، مصنف: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی / صفحات .318، قیمت : -/101 روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

اگر کسی کو اداس دیکھتا ہوں تو میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے، آخر زمانے میں بھی وہ غم کی تلخی کو تبسم کی شیرینی سے چھپانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ (4)

فانی کی شاعری کا محور ان کے صوفیانہ افکار ہیں۔ اس میں حصہ ان کے وطن بدایوں کی مذہبی روایات کا بھی ہے۔ فانی تصوف کو انسانیت کی تکمیل کا راستہ خیال کرتے تھے۔ فانی کے اخلاقی درس کے دو منبع ہیں۔ ایک عشق اور دوسرا غم۔ ان دونوں کے امتزاج سے فانی کو زندگی اور شاعری میں تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے یہاں شاید فانی پر وہ اعتراض بھی رد ہو جائے کہ وہ قنوطی تھے۔ ایک ناقد کا قول ہے کہ صوفی یا عارف قنوطی نہیں ہوسکتا۔ وہ اگر چہ کسی حلقۂ ارادت سے وابستہ نہیں تھے۔ مگر فطری طور پر انھوں نے اپنے ذہن میں جو نظام فکر قائم کیا تھا اس کی مثال صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں نظام عمل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ فانی کے اخلاقی رویے کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

دعا گدائے اثر ہے، گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتمادِ اثر کیا، ملا ملا نہ ملا
اس بحرِ بے کراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا
ہے منع راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

یہی صوفیانہ اور اخلاقی اقدار ہیں جو ان کو شدید مایوسی میں بھی ناامید نہیں ہونے دیتے:

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

فانی کی شاعری کا اگر تجزیہ کریں تو دو دھارے نظر آئیں گے، غم اور عشق۔ اور فانی کے یہاں جہاں بھی لفظ غم آیا ہے اس سے ''غم عشق'' مراد ہے اور عشق کا مفہوم ''عشق الٰہی'' سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا غم ذاتی تھا۔ معاشی مشکلات، اولاد کی بے روزگاری، عزیزوں کی بے وفائی، غریب الوطنی اور اسی کے ساتھ غم عشق۔ اس لیے ان کے غم کی داستان ان کی آپ بیتی بن گئی ہے جس کو فانی پر فکر نے فلسفیانہ رنگ دے دیا ہے۔ بقول فانی:

'' تازہ پھول کا حسن شعر کا ایک ادنیٰ مقام ہے مگر مرجھائے ہوئے پھول کی گزری ہوئی رعنائی، مٹا ہوا رنگ حقیقی شعریت کا ارفع مقام ہے۔''

اور فانی ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو زندگی بھر سینے سے لگائے رہے۔ تازہ رنگ کے پھولوں کو انھوں نے ''فریب رنگ و بو'' خیال کیا ہے:

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرز تبسم، یہ شادابی کیا کہیے

فانی نے غم کو اس لیے اختیار کیا کہ امید اور خوشی کے لمحات یا تو آتے نہیں اور اگر آتے ہیں تو ان کی زندگی بجلی کی چمک سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی اور اس کے بعد پھر غم کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ غم کے جواز میں ان کا یہ فلسفہ بھی دلچسپ ہے۔ خوشی اور نشاط کے سلسلے میں فانی کا رویہ واضح ہے۔ وہ خوشی اور نشاط کو سطحی اور نمائشی چیز خیال کرتے ہیں جو انسان کو پست اور سبک بنا دیتی ہے۔ وہ دنیا کے قہقہوں کا کفارہ اپنے آنسوؤں سے ادا کرتے ہیں:

کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہے خونِ حسرت سے وضو برسوں

فانی کے غم کا رشتہ زندگی سے مل جاتا ہے۔ بقول مغنی تبسم:

'' فانی نے غم ہستی کی اصطلاح کو غم ذات اور غم دنیا دونوں سے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ زندگی کی ناپائیداری کا احساس فانی کے کلام میں جا بجا جھلکتا ہے۔''

جیسا کہ کہا گیا کہ فانی کی شاعری کا محور، غم و عشق ہے۔ عشق سے مراد عشق الٰہی ہے اور یہی تصوف کی اساس ہے۔ بعض معترضین نے فانی کے غم کی طرح ان کے تصوف کو بھی نمائشی اور ہمت شکن تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ تصوف نے اگر ایک طرف ان کو سہارا دیا تو دوسری طرف فلسفیانہ فکر بھی عطا کی ہے۔ اسی کے ساتھ فانی کی شاعری میں تصوف کی بدولت اخلاقیات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔

تصوف کے سلسلے میں ہمارے فلسفیوں اور مفکرین کی جستجو اور تلاش آج تک نامکمل ہے، ہر شخص نے اپنے نقطۂ نظر سے مسائل تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر مذہب میں صوفیانہ عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ آپس کے نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ قدر مشترک ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے۔ وحدانیت کے اس تصور کو دوسرے مفکرین نے ماسوا کی نفی کے ساتھ مانا ہے اور اسلام نے ماسوا کی نفی نہیں کی ہے۔ صوفی نے ذات حق کو اصل مانا ہے اور ماسوا کا انکار اس وقت کیا ہے کہ جب اس کا تصادم وحدانیت کے تصور سے ہونے لگا۔ بہر نوع یہ بحث طویل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فانی نے صوفیانہ نظریات کی وضاحت کن الفاظ میں کی ہے۔

صوفیا کے ہر گروہ نے خواہ وہ وحدت الوجود کا قائل ہو یا وحدت الشہود کا، اس نے ذات حق کی وحدت کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوف کی پہلی منزل وحدت کا اعتراف ہے۔ خدا کی ذات کا اظہار کن الفاظ میں کیا جائے جو اس کی ذات کا احاطہ کر سکے، اس کے لیے تمام صفات ناکافی ہیں:

ہر نام میں اک شانِ تعین ہے بہر حال
جو نام ہے تیرا وہ ترا نام نہیں ہے

جب خدا ہی خدا ہے تو کائنات کی کیا حیثیت ہے نیز خدا اور کائنات کا کیا

رشتہ ہے۔ صوفیا کے نزدیک کائنات کا کوئی وجود خدا سے الگ نہیں ہے:

کچھ نہ وحدت ہے، نہ کثرت، نہ حقیقت، نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

اس ایک مسئلے کے حل ہوجانے سے اس سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کا جواب مل جاتا ہے۔ فنا و بقا، جبر و اختیار، خیر و شر، انسان کی مجبوری اور مختاری کا سوال ہمیشہ ایک سوالیہ نشان بنا رہا۔ اسلامی توجیہہ تو یہ کی جاسکتی ہے کہ انسان کو مختار بنایا گیا ہے مگر اس کی مختاری مرضیِ الٰہی سے وابستہ ہے۔ اسپنوزا کا قول اسلامی نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے کہ ''نہ ہم مجبور محض ہیں اور نہ اخلاقی قدروں سے گریز کرسکتے ہیں۔ اس لیے عمل کی ساری ذمے داری ہم پر آتی ہے۔'' سنت الشعرا اور مسلک صوفیا یہ رہا ہے کہ ہم عکس الٰہی ہیں اور اپنے فاعل کے عمل کے پابند ہیں۔ فانی بھی اس نقطۂ فکر کی تائید کرتے ہیں۔ فانی کا خیال ہے کہ جبر اس لیے ہے کہ تمام افعال انسانی علم الٰہی میں پہلے سے ہیں لیکن اس کی مصلحت نے اختیار کا سانچہ بھی ساتھ کردیا ہے۔ خدا سے امید عفو اس لیے ہے کہ گناہ کی تخلیق بھی اس کی مرضی سے ہوئی ہے:

امیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

تقدیر پرستی کا یہ رجحان ہماری سماجی زندگی میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کا ایک لازمہ سا بن گیا ہے۔ وہ صوفیانہ افکار جو ہندوستانی فلسفے کے اثر سے ہماری سماجی زندگی کا حصہ بن گئے اس کے سب سے بڑے مبلغ شعرائے کرام تھے۔ یہاں سردست ان اثرات سے بحث نہیں ہے بلکہ صرف کہنا یہ ہے کہ فانی نے جبر یہ مسلک کو اس لیے قبول کیا کہ اول تو سنت الشعرا یہی تھی جن کے یہاں صوفیانہ افکار کے نظام میں جبر کو ایک اہمیت حاصل ہے اور سب سے بڑا سبب فانی کی اپنی زندگی کی ناکامیاں ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا فانی کے یہاں جہاں جہاں عشق کا لفظ آیا ہے اس سے عشق الٰہی مراد ہے۔ لہٰذا عشقیہ شاعری کے دوسرے کردار پس پشت چلے گئے ہیں اور یہ جذبۂ عشق اس درجے تک پہنچ چکا ہے کہ خود عاشق کی ذات بھی اس میں گم ہوگئی ہے۔ کاروبارِ عشق میں فانی کی شاعری محض فکری نہیں رہتی بلکہ جذباتی بھی ہوجاتی ہے۔ ان جذبات میں صداقت ہے اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ جب وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ عاشق کی ذات محبوب سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی تو ان میں ایک کیف اور بے خودی کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے:

وحدتِ حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرّے میں عالم ہے پری خانے کا

حسن ہے ذات مری، عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنا، کیا خوب

شعر و ادب کے سلسلے میں ہمارا اولین ردِعمل ذوقی کیفیت کا بے ساختہ اظہار ہے جس کی بنیاد جمالی قدر کی شناخت پر ہوتی ہے۔ شعر میں حسن شناسی کی ضرورت ہر عہد میں محسوس کی گئی ہے۔ حسن شناسی کا یہ مطالبہ الفاظ کے دروبست سے بھی ہوتا ہے اور شاعر کے خیال سے بھی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جمالیاتی قدروں کے اظہار کے لیے اس کے جواز کے طور پر کسی مخصوص نظریے یا دبستان ادب کی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ حسرت موہانی کی غزل کے احیا کے بعد دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی دیواریں منہدم ہوگئیں۔ جدید غزل ایک نئے لب و لہجے کے ساتھ نئے موضوعات کو لیے ہوئے پوری شاعری پر چھا گئی۔ فانی نے ایک جگہ کہا ہے:

خود حسن کمال حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق تمام عشق ہے، یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

فانی کے یہاں جہاں تخیل اور جذبے کا امتزاج ہے۔ وہاں محبت کی رنگینی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ محبت کا موضوع فانی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس لیے جب جب وہ حقیقت سے الگ ہٹ کر مجاز کی طرف آتے ہیں تب بھی ان کے لب و لہجے میں جمالیاتی دل کشی نمایاں رہتی ہے:

چھن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

لبریز تموج تھا اک اک خطِ پیمانہ
محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

آخری دونوں اشعار میں پیکر تراشی کا بڑا خوبصورت اور حسین اظہار ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے فانی کی ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو وہ ''مکالماتی زبان'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ شعر میں گفتگو اور مکالمے کا انداز پیدا ہوجائے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ایسے فقرے ڈرامائی مکالموں سے قریب ہوجاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وصف فانی کے کلام میں نمایاں ہے۔ یہ عمل منظوم ڈراموں اور مثنویوں میں تو

آسان ہے مگر غزل میں اس کا فن کارانہ اظہار نہ ہو تو شعر محض لفظی بازی گری بن کر رہ جاتا ہے۔ فانی کے یہاں اس وصف نے خیال اور بیان دونوں کو نئی راہ دکھائی ہے:

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترس امتحاں سے دور

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

نا خوشگوار ہے جو محبت کا تذکرہ
اچھا تو لاؤ اور کوئی گفتگو کریں

مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذرِ دل قبول
ارشاد ہے کہ آئنہ ہم روبرو کریں

جب ایسے اشعار کسی فن کار کے اظہار کا وسیلہ بن جاتے ہیں تو ''سادگی'' کے ساتھ ''پُرکاری'' کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

فانی کی شاعری پر عام طور سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں بڑے اعتراض یہ ہیں۔ ان کی شاعری عزم اور ولولوں کے لیے ہمت شکن ہے۔ وہ غم کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کا تصوف حقیقت سے دور ہے۔ ان کے خیالات میں تنوع نہیں ہے۔ ان کی شاعری پختگی مشق کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے اعتراضات ہیں جو ان کی غم پسند شاعری پر ہوتے رہے ہیں۔

یہ اعتراضات عام طور سے لوگ اس وقت کرتے ہیں جب وہ یا تو سینہ بہ سینہ روایت کو آنکھیں بند کرکے تسلیم کر لیتے ہیں یا سرسری مطالعے کے بعد چند اشعار کو پڑھ کر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فانی کے یہاں ہمت شکن اشعار بھی ہیں مگر ان کے کلام سے رجائیت پسندانہ اشعار کا بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت ہے ایسے اشعار کے انتخاب کی جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔

ایک شعر میں فانی نے ایک عجیب بات کہی ہے کہ ساحل کا اعتبار ہی دراصل قطرہ اور دریا کے اتصال سے ہے ورنہ ساحل کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔

اس جگہ کو حاصل ہے اعتبار ساحل کا
حد جہاں پہ قطرے کی مل گئی ہے دریا سے (5)

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فانی کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے مگر جس موضوع کو شاعری میں پیش کیا ہے اس میں تنوع موجود ہے۔ اس سلسلے میں مومن خاں مومن کی مثال سامنے ہے۔ ان کا دائرہ محض عشق و محبت تک محدود ہے مگر عشق و محبت کے دائرے میں انھوں نے جو وسعت پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ فانی نے اپنی دنیا غم و آلام کے دائرے تک محدود رکھی مگر غم کے دائرے کو انھوں نے جس قدر وسیع کر دیا اس نے اردو شاعری میں نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے اس کارنامے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے غم کو گوارا بنا دیا۔ ان کے یہاں تنوع کے ساتھ گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اگر ان کی شاعری محض پختگی مشق کا نتیجہ ہوتی تو احساس کی یہ شدت اور اظہار میں یہ خلوص نہ ہوتا۔ خلوص جذبات کے ساتھ سطحیت اور پختگی مشق کا دخل ممکن نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک پختہ مشق شاعر کے یہاں فنی اسقام نہیں ہوں گے۔ ہیئت اور معنی کا امتزاج ہی ایک اچھے فن کار کی پہچان ہے۔ فانی کے کلام میں ان دونوں کا دلکش امتزاج جمالیاتی قدروں کے ساتھ موجود ہے۔

حواشی:

1. بحوالہ ضیا احمد بدایونی، ہماری زبان، دسمبر 1956
2. فانی کی خودنوشت سوانح، مطبوعہ، نگار، جنوری 1941
3. شعر و شاعری، از فانی، سب رس، 1941
4. ہماری زبان، دسمبر 1956
5. اس شعر کا مزید لطف اٹھانا ہے تو اقبال کے اس شعر کو سامنے رکھ کر پڑھیے:

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

□□□

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت-/215 روپے

اردو خبر نامہ

اردو زبان نفرتیں ختم کر سکتی ہے

● لندن۔ 26 اپریل، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان نفرتوں کا زہر اگر کوئی اتار سکتا ہے تو وہ اردو زبان ہے۔ یہ بات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے گذشتہ روز اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (ایس او اے ایس) کی اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام "گوپی چند نارنگ کے ساتھ ایک شام" کے عنوان سے تقریب سے خطاب میں کہی۔ اردو کے ماضی اور مستقبل کے موضوع پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 50 سال سے زائد عرصے پر محیط اپنے ادبی سفر کے دوران وہ اسی کھوج میں ہیں کہ اس زبان میں جو شیرینی جو دل نشینی جو کشش اور جو کھنک اور محاورہ ہے اس کا راز کیا ہے کہ کوئی اردو میں گفتگو کرے تو بات سیدھی دل پر لگتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری جمالیاتی تسکین فقط ہماری زبان سے ہوتی ہے۔ زبان سے انسان کا رشتہ لاشعوری ہوتا ہے جس کو کوئی بدل یا توڑ نہیں سکتا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والی اردو میں یہ خوبی ہے کہ یہ دوسری زبانوں سے چھوت چھات کو روا نہیں رکھتی۔ اردو کی سرپرستی درباروں نے نہیں کی بلکہ اس زبان نے صوفیا، اولیا اور عوام سے رشتہ جوڑا جس کے بعد یہ خوشبو کی طرح پورے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ انھوں نے کہا کہ پارٹیشن سے بہت پہلے اردو برصغیر میں راج کرتی تھی بلکہ پورے جنوبی ایشیا کی رابطے کی زبان تھی۔ آج انگریزی کے تسلط اور غلبے کے باوجود بھی اس کو خطے کی سب سے بڑی زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی زبان کے بولنے والے کا مذہب نہیں دیکھا جاتا مگر اردو کو کم تر کرنے کے لیے اس پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشکل صورت حال کے باوجود اردو بالی ووڈ میں سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ بالی ووڈ کی فلموں کے ٹائٹل پر اردو کی جگہ ہندی تو لکھ دیا جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ گانے ہندی کی بجائے اردو میں کیوں لکھوائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی ٹی وی چینل اردو کے بغیر کامیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ زبانیں اپنی زندگی اور موت کے لیے سرکاروں کی نہیں عوام کی محتاج ہوتی ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ زبان کی عجیب و غریب منطق ہے۔ زبان لفظوں کو جتنا قبول کر سکتی ہے کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبانیں اتنی ہی تبدیل ہوتی ہیں جتنا ان کا مزاج قبول کر سکے ورنہ لاکھ کوشش کریں بڑے سے بڑے لفظ اور محاورے چلن میں نہیں آتے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اگرچہ اردو زبان زوال کی زد میں ہے لیکن اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ درپیش مشکلات کو خود ہی ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے حیدر طباطبائی نے کہا کہ یوں تو اردو میں کئی معروف نقاد گزرے ہیں مگر ڈاکٹر گوپی چند نے اردو کو ایک نئے زاویے سے روشناس کروایا۔ تقریب کے میزبان اور اردو تحریک عالمی کے صدر ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے منظوم کلمات میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ قبل ازیں ایس.او.اے.ایس. اردو سوسائٹی کے صدر ظفر عباس نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ **(اخبار مشرق، دہلی)**

اردو افسانے کی ایک صدی

● پچھلے دنوں شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد کے زیر اہتمام "اردو افسانہ: ایک صدی" کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ "آج کا سب سے بڑا مسئلہ تہذیبی شناخت کا ہے۔ تیس برس پہلے جو زندگی تھی وہ آج بدل گئی ہے۔ اس لیے ادب میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ انھوں نے اردو افسانے کا آغاز سے جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ کہانی کا مقصد اپنے زمانے کے مسائل کا اظہار کرنا نہیں بلکہ انسان کے دکھ درد کو پہچاننا ہے۔ ادب کو تاریخی اعتبار سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تنقید کا کام تفہیم و تحسین ہے۔ تخلیق پر تنقید کی بالادستی کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اب ادبی نظریوں کا دور ختم ہو چکا ہے جو فنکار کو فارمولا دیتے تھے۔ مابعد جدیدیت ایسا کوئی نظریہ مسلط نہیں کرتی۔ جو تحریکیں تھیں جو رجحانات تھے وہ ہماری ادبی روایت میں جذب ہو چکے ہیں۔ مابعد جدیدیت بھی ختم ہو جائے گی، کوئی اور لہر ابھرے گی۔ سیمینار کی ابتدا میں صدر شعبۂ اردو، پروفیسر بیگ احساس نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ ہندوستانی جامعات میں یہ پہلا شعبۂ اردو ہے جو افسانے کی صدی پر قومی سیمینار منعقد کر رہا ہے۔ پروفیسر پی پی سنجے پرووائس چانسلر، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے شعبے کی ادبی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اگر افسانہ صدی پر شعبۂ اردو کوئی پروجیکٹ پیش کرے تو وہ اسے ضرور منظور کروائیں گے۔ جناب محمد رحیم الدین انصاری صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکادمی نے پیش کش کی کہ اکادمی اس سیمینار کے مقالات کو اپنی جانب سے کتابی صورت میں شائع کرے گی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔

اسی شام "شب افسانہ" منعقد ہوئی جس میں محترمہ قمر جمالی، سلام بن

رزّاق، طارق چھتاری، جیلانی بانو، حمید سہروردی، نورالحسنین اور بیگ احساس نے افسانے پیش کیے۔

سیمینار کا پہلا اجلاس ''ابتدائی نقوش اور پریم چند کا دور'' کے عنوان سے منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ اور محترمہ جیلانی بانو نے فرمائی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''پریم چند کو آج کیوں یاد آتے ہیں''، ''پروفیسر م.ن. سعید نے ''اردو افسانے میں پریم چند کا اجتہاد اور امتیاز''، پروفیسر طارق چھتاری نے ''پریم چند کی نئی جہتیں'' موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ دوسرا اجلاس ''ترقی پسند تحریک اور اشتراکی افسانہ'' کے موضوع پر تھا۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت پروفیسر علی فاطمی اور پروفیسر محمد انورالدین پر مشتمل تھی۔ اجلاس میں جناب سلام بن رزّاق اور ڈاکٹر رضوانہ تھیں۔ ڈاکٹر سیما صغیر، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر ستار ساحر'' ڈاکٹر مسرت جہاں اور ر پروفیسر شافع قدوائی نے مختلف عنوانات پر مقالات پیش کیے۔

سیمینار کا تیسرا اجلاس ''قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا عہد'' کے زیر عنوان منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر طارق چھتاری او ر پروفیسر اشرف رفیع نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر صغیر افراہیم کا مقالہ ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی انفرادیت'' ڈاکٹر محمد کاشف نے پیش کیا۔ محترمہ جیلانی بانو نے ''اردو افسانے میں عورت کا بدلتا ہوا کردار''، ڈاکٹر حبیب نثار نے ''ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے درمیان اردو افسانہ'' اور ڈاکٹر عرشیہ جبین نے ''ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے درمیان حیدرآباد میں اردو افسانہ'' کے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ سیمینار کا چوتھا اور آخری اجلاس ''علامتی و تجریدی افسانہ جدیدیت کا دور اور مابعد جدید افسانہ'' پر منعقد ہوا۔ صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے فرمائی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی ، جناب نورالحسنین، پروفیسر فاطمہ پروین اور پروفیسر حمید سہروردی نے مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر حمید سہروردی اور پروفیسر فاطمہ پروین نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد انوارالدین، نورالحسنین، ڈاکٹر میر محبوب حسین، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر محمد کاشف، جناب محمد سمیع الدین اور جناب محمد اقبال نے سیمینار سے متعلق تاثرات پیش کیے۔

(ڈاک سے)

تحریک آزادی اور اردو ادب

● نئی دہلی۔ 25 اپریل، محکمۂ فن، ثقافت والسنہ اردو سیل دہلی سرکار کی جانب سے منعقد دو روزہ سیمینار ''تحریک آزادی اور اردو ادب کے افتتاحی اجلاس کے علاوہ پہلے اور دوسرے اجلاس میں اردو زبان و ادب کا بھرپور جائزہ لیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا شعری اور ادبی سرمایہ تحریک آزادی سے پوری طرح وابستہ ہے لہٰذا اس کو الگ کرکے ہم تحریک آزادی کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شکیل اختر نے کی جبکہ دہلی سرکار کے جوائنٹ سکریٹری کلانند جوشی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ تحریک آزادی کے حوالے سے جو چیزیں پیش کی گئی ہیں خواہ وہ شعری ہوں یا نثری ان کا جائزہ اس انداز سے لینا مناسب نہیں ہے کہ ان میں جذبات، نظریات اور احساسات شامل نہیں کیونکہ ان کے بغیر تخلیق وجود میں آتی ہی نہیں ہے۔ جذبات، نظریات، خیالات اور احساسات سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پہلے اجلاس میں مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ منٹو واحد افسانہ نگار ہے جس کے افسانوں میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی سیاسی اور سماجی زندگی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اردو افسانوں میں تحریک آزادی کے تخلیقی اظہار پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر انور پاشا کا مقالہ ''اردو ناولوں میں تحریک آزادی کی عکاسی ان کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر مولا بخش نے ''تحریک آزادی اور اردو نوآبادیاتی ادب'' پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ مسندِ صدارت سے شریف الحسن نقوی اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی اور شاہد ماہلی نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فیاض عالم نے انجام دیے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ تحریک آزادی کا صحیح مطالعہ اردو ادب کے مطالعے کے بغیر ناممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ 19 دیں صدی کے آتے آتے اردو میں وہ قوت و صلاحیت پیدا ہوچکی تھی کہ وہ انقلاب برپا کرسکے۔ پروفیسر شاہ حسین نے بہادر شاہ ظفر اور اردو اخبارات اور ڈاکٹر سیف اللہ نے پریم چند کے افسانے اور تحریک آزادی پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد اردو زبان و ادب کا موجودہ منظرنامہ پر مذاکرے کا آغاز ہوا جس میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے این یو کے ریسرچ اسکالروں، ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی، ممتاز عالم رضوی، ارشد، خالد مبشر، افسانہ، ڈاکٹر نشازیدی وغیرہ نے حصہ لیا۔ آخر میں ڈاکٹر مولا بخش نے تمام گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ نئی نسل میں اچھے مقرر پیدا ہورہے ہیں جو حالات پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان کا مسئلہ دراصل ہمارے وجود کا مسئلہ ہے۔ زبان کی کیا حالت ہے اس کا رونا رونے کی بجائے ہمیں اپنا صحیح کردار ادا کرنا چاہیے۔ آخر میں اردو آفیسر ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار میں ضمیر دہلوی، مرغوب حیدر عابدی، ڈاکٹر ارجمند آرا، شمس رمزی،

راغب الدین، محمد شمیم، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر تنویر حسین، کے علاوہ کافی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● نئی دہلی۔ 26 اپریل، اقبال نے تحریک آزادی میں ہر پہلو سے عوام کی حوصلہ افزائی کی اور ملک کے باشندوں کے درمیان اتحاد کی بات کی نیز انگریزوں کے ذریعے استحصال کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کی ان خیالات کا اظہار آج یہاں پروفیسر عبدالحق نے اردو اکادمی میں تحریک آزادی او راردو ادب کے موضوع پر دو روزہ سیمینار کے آخری روز اپنے مقالے ''تحریک آزادی اور اقبال'' میں کیا۔ آج دوسرے روز پہلے اجلاس میں پروفیسر مظفر حنفی نے جنگ آزادی میں اردو شاعری کے کردار، ڈاکٹر کوثر مظہری نے تحریک آزادی اور اردو غزل اور ڈاکٹر مشتاق صدف نے ضبط شدہ نظمیں، ایک تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے اپنے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر صادق اور جناب ضمیر حسن دہلوی نے کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر جمیل اختر نے 1857 کے روزنامچے پر مقالہ پڑھا۔ تمام مقالوں پر صحت مند بحث ہوئی۔

دوسرے اجلاس میں ابرار رحمانی نے ''پریم چند غیر افسانوی نثر کے آئینے میں'' اور ڈاکٹر ارشاد نیازی نے جنگ آزادی میں بھگت سنگھ کا کردار کے موضوع پر مقالے پڑھے۔ مجلس صدارت میں ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر معین الدین جینابڑے اور مرغوب حیدر عابدی شامل تھے۔ اس کے بعد اردو زبان وادب پر مذاکرہ ہوا جس کی شروعات مشتاق صدف نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

دکن میں فارسی زبان کا فروغ

● حیدرآباد۔ 28 مارچ، فارسی زبان نے برسہا برس ہندوستانی عوام میں محبت واخوت کو فروغ دیا۔ فارسی زبان نے ہندوستان بالخصوص دکن میں جتنا فروغ پایا شاید ہی کسی اور علاقے میں اسے ایسا مقام حاصل ہوا ہوگا۔ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی پروفیسر ٹی. ترویتی راؤ نے آج یہاں شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی اور فارسی اسکالرس ایسوسی ایشن نئی دہلی کے زیر اہتمام پی. جی. آر. آرڈنٹس ایجوکیشن آڈیٹوریم میں منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ایران کی جامعات اور عثمانیہ یونیورسٹی کے درمیان تعلیم وتہذیب کے فروغ کے ضمن میں یادداشت، مفاہمت پر دستخط کیے جائیں۔ پروفیسر ٹی. ترویتی راؤ نے کہا کہ شعبۂ فارسی کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت عمل میں لایا گیا تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی پہلی جامعہ ہے جس کا ذریعۂ تعلیم مقامی زبان یعنی اردو زبان ہے۔ انھوں نے فارسی زبان کو شیریں زبان قرار دیا اور کہا کہ فارسی زبان ہندوستان اور ایران کے تعلقات میں مزید استحکام پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ انھوں نے سیمینار کے اہتمام پر شعبہ فارسی کو مبارکباد دی اور کامیابی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ نائب وزیر سائنس ریسرچ وٹیکنالوجی حکومت ایران سید محمد حسینی نے اپنے خطاب میں سیمینار کے مقاصد سے متعلق اظہار ستائش کیا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان صدیوں سے ہندوستان میں بولی جارہی ہے۔ جبکہ ہندوستان اور ایران کی تہذیب میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ سید محمد حسینی نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان میں بڑے بڑے شعرا گزرے ہیں۔ انھوں نے فارسی کے لیے ہر ممکن اقدام کا اعلان کیا۔ سفیر افغانستان برائے ہند، ڈاکٹر سید محمد مخدوم رہین نے کہا کہ ایران اور افغانستان کی تہذیب مشترکہ ہے اور اس کی جھلک ہندوستانی تہذیب میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کئی زبانوں اور بولیوں کا دیس ہے۔ یہاں ہر زبان کو پنپنے کا موقع حاصل ہے۔ اس طرح فارسی زبان نے ہندوستان بالخصوص دکن میں زبردست ترقی حاصل کی۔ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی و پروفیسر اسلامک اسٹڈیز پروفیسر سلیمان صدیقی نے اپنے کلیدی خطاب میں زبان فارسی کی ہندوستان میں آمد اور فروغ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دکن میں سب سے پہلے مسلمانوں نے 1300 میں قدم رکھا۔ بہمنی سلطنت کے بانی نے 1300 میں دکن کا رخ کیا، بعد ازاں 1347 تا 1538 بہمنی سلطنت برخاست ہوگئی جبکہ 1538 تا 1724 قطب شاہی، عادل شاہی، آصف جاہی، نظام شاہی سلطنتوں کا دور دورہ رہا۔ دکن میں سب سے پہلے خلد آباد اور دولت آباد میں مسلمان آباد ہوئے۔ یہاں ان کی تاریخ، تہذیب اور تعمیر کی جھلک آج بھی قائم ہے۔ بیرون ملک اور شمالی ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور اساتذہ نے جنوبی ہند کا رخ کیا۔ پروفیسر سلیمان صدیقی نے کہا کہ فارسی صوفیانہ تعلیمات پر چھائی رہی۔ امیر حسن اعلیٰ سنجری دکن میں آباد ہونے والے متعدد اساتذۂ ادب، تہذیب وزبان میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ حضرت بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں اور 13، 14 اور 15 ویں عیسوی کے نستعلیق کے دستاویزات جیسے فرمان نامہ، اقرار نامہ، وصیت نامہ وغیرہ کو یکجا کرنے اور ان کے ترجمے کا کام کررہے ہیں۔ انھوں نے ذمے داروں پر زور دیا کہ وہ طلبہ کو فارسی زبان سے نہ صرف رغبت دلائیں بلکہ انھیں ماہرانہ تربیت بھی دیں تاکہ فارسی زبان میں ہمارے بزرگوں سے حاصل ہوئے تہذیبی اثاثے سے استفادہ ہوسکے۔ انھوں نے کہا کہ آج لائبریریوں میں فارسی کتابیں گرد وغبار میں اٹی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد تنویر الدین خدانمائی صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور اپنے خطاب میں کہا کہ اس کانفرنس میں نہ صرف ایران بلکہ افغانستان، تاجکستان اور

برطانیہ سے اسکالرس شرکت کررہے ہیں جبکہ ملک بھر سے بالخصوص کشمیر یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، جامعہ ملیہ، علی گڑھ، اورنگ آباد، پونا اور امراوتی یونیورسٹی سے مندوبین شرکت کررہے ہیں۔ اس موقع پر ڈائرکٹر پرشین لٹریری فاؤنڈیشن، ایران ڈاکٹر ہادی سعیدی، ڈائرکٹر ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن ایران ڈاکٹر حسن کھوجستے، صدر نشین ان آر آئی کلب تاج احمد خاں اور صدر پرشین اسکالرس ایسوسی ایشن پروفیسر ماریہ بلقیس و دیگر بھی موجود تھے۔ قبل ازیں پروفیسر تروپتی راؤ نے خصوصی سوونیئر کی رسم اجرا انجام دی۔

(منصف، حیدرآباد)

چین کی نئی نسل اردو کی جانب راغب ہورہی ہے

● نئی دہلی۔ 23 اپریل، چین میں اردو کے معروف شاعر چانگ شی سوان (انتخاب عالم) کا کہنا ہے کہ ان کے ملک میں نئی نسل اردو کی جانب راغب ہورہی ہے اور آج کل ملک کی 4 یونیورسٹیوں میں گریجویٹ سطح کے اردو کورس کرائے جارہے ہیں۔ اس کے بعد ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ انھیں شروع سے ہی اردو میں دلچسپی تھی اور انھوں نے اردو کی تعلیم 1963 میں لینی شروع کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں اردو صحافت کا موقع بھی ملا جب انھوں نے ''چائنا پریٹوریا'' میں کام کیا۔ یہ پرچہ پوری دنیا میں جاتا تھا اور اس کا ایک اردو ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت چین میں اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ شائع نہیں ہورہا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ چین کی نئی نسل اب اردو کی جانب راغب ہورہی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ چین کے دو بڑے پڑوسی ملکوں میں اردو کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ اردو سیکھنے والے صرف مسلم نوجوان ہیں بلکہ غیر مسلم بھی کافی تعداد میں اردو سیکھ رہے ہیں۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ویسے تو انھوں نے بہت سے شعرا کو پڑھا ہے لیکن وہ میر تقی میر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے بعد مرزا غالب اور علامہ اقبال پسند ہیں۔ عہد حاضر کے شعرا کے تعلق سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر شہریار اور ڈاکٹر بشیر بدر اچھے شاعر ہیں۔ پاکستان میں موجودہ شعرا میں سحر انصاری، حمایت علی شاعر اور امجد اسلام امجد قابل ذکر شاعر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے اور اردو اب ایک آفاقی زبان بن چکی ہے جس کے بولنے، پڑھنے والے اب پوری دنیا میں موجود ہیں لیکن آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو روزگار سے جوڑا جائے۔ آج کی نسل اگر انگریزی کی جانب زیادہ توجہ دے رہی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ انگریزی پڑھ کر وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں روزگار حاصل کرسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں ایک ہزار کے قریب زبانیں ہیں لیکن ان میں 90 فی صد زبانیں دم توڑ چکی ہیں یا توڑ رہی ہیں۔ صرف وہی زبانیں زندہ بچی ہیں جو روزگار سے جڑی ہوئی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شاعر مشرق پر سیمینار

● نئی دہلی۔ 23 اپریل، آج سے تقریباً 71 سال قبل شاعر مشرق علامہ اقبال کا انتقال ہوا تھا، لیکن آج بھی ان کی فکر ان کا فلسفہ ان کی شاعری نہ صرف انفرادی طور پر ہمیں متاثر کرتی ہے بلکہ ہمارے اجتماعی حافظے کا بھی ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔ علامہ اقبال کے یوم وفات پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یک روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے شاعر مشرق علامہ اقبال کے مختلف شعری مجموعوں، ان کے افکار وخیالات، مغربی ومشرقی دانشوروں کی نظر میں علامہ اقبال کے مرتبے کا تفصیل سے ذکر کیا۔ نیز ان کی سیاسی، فلسفیانہ وادبی بصیرتوں پر روشنی ڈالی۔ اس سیمینار کا اہم مقالہ ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے بعنوان ''تاریخ تصوف کا تعارف'' پیش کیا۔ انھوں نے کلام اقبال میں مذکور صوفیانہ علامتوں، سلوک کی مختلف منزلوں، مسالک کی ذمے داریوں اور مختلف ماخذ کے حوالے سے علامہ اقبال کے مختلف نظریات پر بحث کی۔ دانش حسین خاں ریسرچ اسکالر (ایم فل) نے علامہ اقبال کی غزل گوئی اور علی احمد ادریسی نے ''علمی وادبی دنیا پر علامہ اقبال کے اثرات'' پر مقالے پیش کیے۔ مقالات کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا جس میں گرما گرم مباحثہ ہوا۔ نظامت کا فریضہ شعبۂ اردو میں ایم فل کی طالبہ افسانہ بیگم نے انجام دیا۔ پروگرام کے آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے تمام مقالوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے پیش کردہ مقالات کی خوبیوں اور کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا، ساتھ ہی سیمینار میں موجودہ تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کے ساتھ ریلوے کی زیادتی

● علی گڑھ۔ 13 اپریل، علی گڑھ جنکشن کے پلیٹ فارم نمبر دو کے گیٹ پر ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں میں علی گڑھ واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا مگر اس میں سے اردو زبان میں لکھا ہوا ''علی گڑھ'' مٹا دیا گیا اور اسٹیشن کے ہر دروازے پر ایسا ہی ہوا ہے۔ اس معاملے میں اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ریلوے کا خاص حکم ہے اردو، ہندی اور

انگریزی تینوں زبانوں میں اسٹیشن کا نام لکھا جائے اور علی گڑھ میں برسوں سے تینوں زبانوں میں نام لکھا ہوا تھا مگر اردو میں نام کو واضح کرنا رہ گیا، معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے حکم دیا جائے گا کہ اس کو واضح کیا جائے۔

اس سلسلے میں پروفیسر شہریار نے کہا کہ علی گڑھ جیسے مسلم اکثریت والے علاقے میں اردو کے ساتھ تعصب برتنا افسوس کا مقام ہے۔ علی گڑھ ریلوے حکام کو چاہیے کہ جلد سے جلد اس کو پھر واضح الفاظ میں لکھوائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مسلم گھرانے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینا شروع کردیں تو ایسی چیزیں نہیں ہو پائیں گی۔ جب لوگوں کو اردو پڑھنا آئے گا تو ایسی چیزوں کی طرف نگاہ پڑے گی اور اس وقت ان سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کی ہمت نہیں ہوگی ایسا کام کرنے کی، چونکہ لوگ اردو پڑھتے نہیں ہیں اس لیے لوگوں کی نظر ادھر کم ہی جاتی ہے اور جو اردو سے تعصب رکھتے ہیں وہ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو بالکل مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بین اللسانی مشاعرہ

● کولکاتا۔ گذشتہ دنوں بنگلہ اکادمی کولکاتا کے ہال میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں مختلف زبانوں کے شعرا نے حصہ لیا جس کی صدارت بزرگ شاعر حضرت قیصر شمیم نے کی۔ ہندی، اردو، بنگلہ، پنجابی، اڑیہ، سنتھالی اور اسمیہ زبانوں کے شاعروں نے اپنی اپنی زبان میں لکھی ہوئی کویتائیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔ اس پروگرام کی نظامت پروفیسر رام الہاد چودھری نے انجام دی۔ شاعروں نے عصر حاضر کے سلگتے ہوئے موضوعات کو سامعین کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر نردوش (پنجابی)، شری رام لوچن ٹھاکر (میتھلی) پرنب بروا (اسمیہ) نے کویتائیں پڑھیں۔ تبھی ناظم مشاعرہ نے پروگرام میں کچھ تبدیلی کرکے قیصر شمیم کو پڑھنے کی دعوت دی، انھوں نے اپنی دو نظمیں ''مجھے دکھ ہے'' اور ''ایک موڑ پر'' پیش کیں جن میں انھوں نے حالات حاضرہ پر اپنا ردِعمل استعاراتی انداز میں پیش کیا تھا۔

چودھری نے کہا کہ قیصر شمیم کی نظمیں صرف اردو والوں میں مقبول نہیں بلکہ ہندی والوں میں بھی کافی پسند کی جاتی ہیں۔ رسالہ ''مغربی بنگال'' کے مدیر مصطفےٰ اکبر نے ایک نظم اور غزل کے چند اشعار پیش کیے۔ عنبر شمیم نے ایک نظم ''زہر آلو'' سنائی۔

اسمیہ زبان کے کوی ہیمنت بھٹاچاریہ نے ''پھاگن ماہ'' اور ''مورجنم بھومی'' کے عنوان سے کویتائیں سنائیں، ان کے بعد اڑیہ زبان کے شاعر کرچن بھوٹیاں نے کولکاتا کی تاریخی عمارت ''وکٹوریہ'' اور ''دوب گھاس'' کے عنوان سے دو کویتائیں پیش کیں۔ ہندی کے معروف کوی مانک بچھاو نے ''ایک دن چلا جاؤں گا پھر لوٹ کر آؤں گا'' اور ''تم کویتا لکھ سکتے ہو'' سنا کر داد حاصل کی۔ سنتھالی زبان کے شاعر ہری مل ہیرم نے اپنی کویتا ''مہابھارت'' پہلے سنتھالی زبان میں پڑھی پھر اسی نظم کا ترجمہ بنگلہ زبان میں پڑھ کر سامعین کو لطف اندوز کیا۔ ہندی شاعرہ کسم جین نے پہلی کویتا ''دکھو میاں'' کے عنوان سے قاضی نذرالاسلام کی نذر کہہ کر پیش کی۔ دوسری کویتا ''سیتا'' کے عنوان سے سنائی۔ رام الہاد چودھری نے عراق اور افغانستان میں جاری بربریت کے حوالے سے نظمیں پیش کیں۔ آخر میں ایک بار پھر صدر محفل قیصر شمیم نے ایک طویل نظم پیش کی جس میں سماجی برائیوں کی منظرکشی خوبصورت انداز میں کی گئی تھی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مغربی بنگال بنگلہ اکادمی ایسے پروگرام کرانے پر مبارک باد کی مستحق ہے کیوں کہ اس طرح مختلف زبانوں کے شعرا اور ادبا کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور باہمی محبت اور یک جہتی کو فروغ دینے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی۔ 23اپریل، نیوسیلم پور میں واقع شہید اشفاق اللہ خاں پارک میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک میٹنگ زیر صدارت مولانا ایم رضوان اختر قاسمی منعقد ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری طور پر متعدد ریاستوں میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے مگر عملی طور پر اس کا کچھ خاص اثر نظر نہیں آتا۔ سرکاری اسکولوں، دفاتر اور کسی وزیر یا سکریٹری کے دفتر کے نام کی تختی بھی اردو میں نظر نہیں آتی۔ اس موقع پر پنکج جھا نے کہا کہ برسوں سے معمول کے مطابق ریلوے اسٹیشن پر اردو میں نام لکھے جاتے تھے۔ اب وہ بھی مٹتے جارہے ہیں۔ دہلی میٹرو میں اردو ندارد ہے۔ دہلی کے پرانے اسٹیشنوں پر اردو تحریر کو ڈھک دیا جاتا ہے یا کاٹ دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے اپنے علاقے کے نمائندوں سے اردو کے فروغ کے لیے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ لیا جائے۔ میٹنگ میں سالک دھامپوری، ماسٹر محمد تحسین، محمد جلیس سیفی، عالیہ شاہ سیفی، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی اور دیپک جھا وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 24اپریل، غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آج ''شام شہریاراں'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر برطانیہ سے آئے معروف افسانہ نگار محسن شمسی اور ملک کے معروف شاعر مخمور سعیدی نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ محسن شمسی نے بدلتے سماج کے نئے منظرنامے کے حوالے سے اپنا افسانہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ مخمور سعیدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ انھوں نے غالب کی

زمین میں معیاری اشعار پڑھ کر داد و تحسین حاصل کی۔ محسن عشمی کے افسانہ پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، شمس الحق عثمانی اور ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● ممبئی۔ 29 مارچ، بروز اتوار شام 6 بجے مہیلا منڈل ہال، کرلا (مغرب) میں ''اردو خبرنامہ'' کے زیر اہتمام معروف افسانہ نگار انور قمر اور مقدر حمید کے افسانوی مجموعوں ''جہاز پر کیا ہوا؟'' پر گفتگو کی گئی۔ سلام بن رزاق نے صدارت کی جبکہ اقبال نیازی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ساجد رشید، ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور سید فیض الحسن مہمانانِ خصوصی تھے۔ اس جلسے میں کثیر تعداد میں ممبئی کے افسانہ نگار، شاعر، ادیب، صحافی اور اردو زبان و ادب کے شیدائی شریک ہوئے۔ صدر جلسہ سلام بن رزاق کے علاوہ وقار قادری، پروفیسر الیاس شوقی، رحمٰن عباس، صادقہ نواب سحر، ساجد رشید اور صاحبانِ اعزاز انور قمر اور مقدر حمید نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ دونوں افسانہ نگاروں کی خدمت میں ان کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے پیشِ نظر یادگار مومینٹو (اعترافیہ) شال اور گلدستے پیش کیے گئے۔ جلسے کی ابتدا وقار قادری کے مضمون سے ہوئی جس میں وقار قادری نے انور قمر کے افسانوں پر مدلل گفتگو کی۔ پروفیسر الیاس شوقی نے دونوں صاحبانِ اعزاز کے فن پر مختصر اظہار خیال کیا اور کہا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ مقالہ نہیں لکھ سکے اور وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد انور قمر اور مقدر حمید کی ان کتابوں پر مضامین لکھیں گے۔ رحمٰن عباس نے کہا کہ انور قمر کی کتاب پر فضیل جعفری اور مقدر حمید کی کتاب پر ندا فاضلی نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ اتنے سینئر افسانہ نگاروں کو بھی خود کو پروجیکٹ کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ صادقہ نواب سحر نے انور قمر اور مقدر حمید کی کتابوں کا موازنہ کرتے ہوئے انھیں عصمت، منٹو، بیدی اور کرشن چندر کے بعد کی نسل کے اہم اور معتبر افسانہ نگار تسلیم کیا۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے دونوں صاحبانِ اعزاز کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پر اظہار افسوس بھی کیا کہ اردو کا پروگرام مراٹھی اسکول میں کیا جا رہا ہے ساتھ ہی اردو اسکولوں اور انتظامیہ کے رویے کی سخت مذمت بھی کی۔ ساجد رشید نے ندا فاضلی، سکندر احمد اور م۔ ناگ کے نام لے کر کہا کہ تینوں حضرات اس جلسے میں مدعو تھے۔ لیکن یہ تینوں جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ساجد رشید نے کہا کہ ندا صاحب کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ادبی جلسوں میں شرکت کی دعوت تو قبول کر لیتے ہیں لیکن شریک نہیں ہوتے۔ میں ان کے اس رویے کی پُرزور مذمت کرتا ہوں۔ ساجد رشید نے پٹنہ سے آئے ہوئے نقاد سکندر احمد پر بھی طنز کرتے ہوئے کہا کہ سکندر احمد صرف انھی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں جن میں انھیں صدارت دی جاتی ہے اور رہی م۔ ناگ کی بات تو وہ گذشتہ تیس برسوں سے ایسے ہی چل رہے ہیں۔

سلام بن رزاق نے خطبۂ صدارت میں ''اردو خبرنامہ'' کے مدیر اشتیاق سعید اور جلسے کے کنوینر رمضان علی سحر کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اشتیاق سعید، رمضان علی سحر اور ان کے رفقائے کار نے کرلا میں ادبی جلسوں کا سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے ممبئی شہر کے ادبی ماحول میں ایک نئی ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ ساجد رشید کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہم ندا فاضلی کی تو قدر کرتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ غیر ذمے داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ سلام بن رزاق نے انور قمر کی کتاب پر فضیل جعفری کے دیباچے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ دیباچہ پڑھ کر لگتا ہے کہ فضیل جعفری نے مجموعے کو سنجیدگی سے پڑھے بغیر دیباچہ لکھا ہے۔ اس جلسے کے کنوینر رمضان علی سحر تھے۔ ''اردو خبرنامہ'' کے ایڈیٹر اشتیاق سعید نے صاحبانِ اعزاز، مہمانان، مقالہ نگار، مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم ماہ بہ ماہ اسی طرح کی ادبی تقریب منعقد کرتے رہیں گے تاکہ ماضی کی طرح کرلا پھر سے ادبی سرگرمیوں کا گہوارہ کہلا سکے۔ (ڈاک سے)

● سنبھل۔ 6 اپریل، ہند انٹر کالج میں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی میموریل کمیٹی اتر پردیش کے زیر اہتمام ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے یومِ پیدائش پر منعقد جلسے کو خطاب کرتے ہوئے جناب ظفر علی نقوی نے کہا کہ ملک و قوم کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سماج کے ہر طبقے کو یکساں تعلیمی مواقع حاصل ہوں۔ اقلیتی طبقہ جو ابھی تعلیمی میدان میں ملک کے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں کافی پسماندہ ہے اسے ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے لیے تعلیمی کاموں پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ اسی مقصد سے موجودہ سرکار نے خصوصی توجہ دیتے ہوئے کمیٹیاں تشکیل دی ہیں جو اقلیتی خصوصاً مسلمانوں کے تعلیمی امور کا جائزہ لے رہی ہیں۔ مدرسوں کی تعلیم کی جدید کاری پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ باتیں انھوں نے ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام کی کتاب ''ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی علمی اور ادبی خدمات'' کی رسم رونمائی انجام دیتے ہوئے کہیں۔

مہمان ذی وقار روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ جناب احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ ہمیں اردو زبان کو ایک تحریک دینی ہوگی۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے کہا کہ ڈاکٹر ریاض الاسلام نے جس خلوص کے ساتھ اپنے استاد کی یاد کو قائم کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے کہا کہ بھائی جان نے آٹھ سال کی عمر سے قلم اٹھایا اور تا زندگی قلم کا استعمال ہتھیار کی طرح کرتے رہے۔ ہیوٹ مسلم انٹر کالج کے پرنسپل چاند میاں نے کہا کہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی نے علم کی جو شمع روشن کی تھی ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی لو کو مدھم نہ

ہونے دیں۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر اوصاف احمد نے کہا کہ سعادت علی صدیقی مرحوم نے جس سنجیدگی کے ساتھ اس شہر کی خدمت کی وہ اہل ادب اور اہل سنبھل کے لیے قابل فخر ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض الاسلام نے اپنے استاد مرحوم پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ان کی یاد میں ''یوم سعادت'' کا انعقاد کر کے لائق شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

اس موقع پر سماج کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والے، جناب محمد راشد اور جناب وقار احمد رومانی کو تعلیمی و ادبی خدمات، ڈاکٹر امیش چندر سکسینہ کو طبی و سماجی خدمات، جناب احمد ابراہیم علوی مدیر اعلیٰ اردو روز نامہ ''آگ'' لکھنؤ کو اردو صحافت، جناب حماد احمد اور مشیر خاں ترین کو تعلیمی خدمات کے لیے آفتاب سعادت ایوارڈ 2009 پیش کیے گئے۔

(ڈاک سے)

● مالیگاؤں۔ ادارہ نثری ادب مالیگاؤں کا ایک معتبر ادبی ادارہ ہے اور گذشتہ کئی برسوں سے اردو ادب خصوصاً نثری ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ ادارہ ہر سال ایک سالانہ تقریب کا انعقاد بھی کرتا ہے۔ ان تقاریب میں شہر اور بیرون شہر کے طلبہ و طالبات، اساتذہ اور اہل ذوق اور ادب کا شغف رکھنے والے افراد کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

گذشتہ دنوں ادارے کی ماہانہ نشست میں ڈاکٹر اقبال برکی کے تحریر کردہ بچوں کے ناول ''دھوئیں کا راز'' کا اجرا عمل میں آیا۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے فرمائی ناول کی رونمائی رضوان احمد عبدالمطلب شیخ صاحب نے کی جب کہ ناول کا اجرا جمیل احمد کرانتی صاحب کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے فرمائی اور ناول کی رونمائی رضوان احمد عبدالمطلب شیخ صاحب اور جمیل احمد کرانتی صاحب نے کی۔

تقریب میں اردو کی جس معتبر شخصیات نے شرکت کی۔ ان میں جاوید احمد انصاری، محمد عمران انصاری، شیخ عبداللہ اور ناگپور سے تشریف لائے بچوں کے ادیب وکیل نجیب، بشیر ادیب، لطیف جعفری، لطیف عزیز، اقبال مرتضیٰ، مقیم اثر بیاولی، سلطان سبحانی، عرفان عارف، رائے حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر افتخار احمد انصاری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محترم طاہر انجم صدیقی، ڈاکٹر اردن فراز اور اسحٰق خضر صاحب ''دھوئیں کا راز'' اور مصنف ڈاکٹر اقبال برکی کے اسلوب پر مضامین جمیل احمد کرانتی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور ڈاکٹر الیاس صدیقی وغیرہ نے اپنے تاثرات میں ناول پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وکیل نجیب نے پیش کیے۔ کہا کہ بچوں کے لیے لکھنے سے پہلے مصنف کو بچہ بننا پڑتا ہے اور اقبال برکی نے ایسا ہی کیا ہے۔

اس تقریب میں ادارہ نثری ادب کی جانب سے ڈاکٹر اقبال برکی کو ایک شال اور سپاس نامہ پیش کیا گیا اور تقریب کے صدر ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے کتاب کی پہلی جلد کے لیے اعزازی قیمت پندرہ سو روپئے عطا کی۔ رضوان احمد عبدالمطلب شیخ صاحب نے ناول کی سو جلدیں خریدیں اور طلبہ میں تقسیم کیں۔ اس طرح دیگر اہل ذوق حضرات نے بھی اعزازی قیمت دے کر ناول خریدا۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 7 اپریل، معروف افسانہ نگار اور پوسٹل سروسیز بورڈ حکومت ہند کے نو منتخب ممبر پلاننگ دیپک بُدکی اور انجمن محبان اردو ہند۔ قطر کے جنرل سکریٹری عزیز نبیل کے اعزاز میں ایک تہنیتی تقریب کا انعقاد سی ایس او آئی کلب میں ہوا، جس کی صدارت نیشنل کونسل فار ٹیچرس ایجوکیشن، منسٹری آف ایچ آر ڈی کے ممبر سکریٹری حسیب احمد نے کی، جبکہ نظامت آئیڈیا کمیونیکیشنز (قومی میڈیا سوسائٹی) کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے کی۔

آئیڈیا کمیونیکیشنز کے زیر اہتمام منعقد اس اعزازی جلسے کے مہمان خصوصی سینٹرل کاٹیج انڈسٹریز کارپوریشن کے منیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر ایم اے ابراہیمی تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ابراہیمی نے کہا کہ آج اردو زبان کے دائرے کو مزید وسعت دینے اور عصری ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔ فکشن کے علاوہ نان فکشن جیسے سائنس، معاشیات، سماجیات وغیرہ میں بھی اردو کے قابل قدر ذخیرے تیار کیے جانے چاہئیں۔ حسیب احمد نے اپنے صدارتی کلمات میں اس قسم کی سنجیدہ اور منتخب ادبی نشستوں کے انعقاد پر آئیڈیا کمیونیکیشنز کو مبارکباد دی اور کہا کہ معیاری ادب کو فروغ دینے میں اس قسم کی نشستوں کا انعقاد بے حد ضروری ہے۔ دیپک بُدکی نے دو افسانے ''مانگے کا اجالا'' اور ''گھونسلہ'' پڑھ کر سنائے جبکہ شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 9 اپریل، محبان اردو دہلی کی جانب سے آج شام ایوان غالب میں شامِ غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں نیویارک سے آئی ہوئی گلوکارہ سویتا آہوجہ نے اپنی دلکش اور سریلی آواز سے سامعین کو مسرور کر دیا۔ ان کا ساتھ استاد اقبال احمد خان نے دیا۔ سویتا آہوجہ نے عہد حاضر کے مختلف جدید شعرا کا کلام پیش کیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی کے طور پر سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس، جسٹس سبھر وال نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔ ان کے علاوہ اہم شخصیات میں پروگرام کے روح رواں عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ، عظیم اختر، پروفیسر صادق، شاہد ماہلی، متین امروہوی اور ڈاکٹر رضا حیدر وغیرہ موجود تھے۔ پروگرام میں بہت بڑی تعداد میں وکلا نے بھی شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اعزاز و اکرام

● نئی دہلی۔ یکم اپریل، معروف ماہر تعلیم پروفیسر جلیس احمد خان ترین ان دنوں پانڈیچری سینٹرل یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہیں، انھیں پیر کو راشٹرپتی بھون کی ایک پروقار تقریب میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل نے انھیں یہ ایوارڈ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات کے لیے تفویض کیا۔ اس موقع پر وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، نائب صدر حامد انصاری، لوک سبھا کے اسپیکر سوم ناتھ چٹرجی، متعدد فلمی ہستیاں اور دیگر معزز حضرات موجود تھے۔ پروفیسر ترین نے اپنا تعلیمی سفر اپنے آبائی وطن میسور کے ایک سرکاری اردو اسکول سے شروع کیا اور میسور یونیورسٹی سے ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، سائنسی موضوعات پر ان کی دو کتابیں پورے ملک میں داخل نصاب ہیں، ان کی کتاب ''فائر انڈ راسٹو فلیکس'' اور ''دی ریٹرن آف کشمیر یونیورسٹی'' نے ان کو بین الاقوامی شہرت دلائی۔ پروفیسر ترین نے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور وہاں کے علمی ماحول کو بحال کر کے اسے درجۂ اول کی یونیورسٹی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2008 میں پانڈیچری یونیورسٹی کی ذمے داری سنبھالنے سے پہلے وہ ساؤتھ ایشین فاؤنڈیشن کے چیف ایکزیکیوٹو آفیسر بھی رہ چکے ہیں۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● جمشید پور۔ یکم اپریل، انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کے زیراہتمام مائیکل جان آڈیٹوریم میں ایک ادبی تقریب میں مجتبیٰ حسین کو امیر خسرو قومی ایوارڈ 2009 سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت سید رضا عباسی رضوی چھمن صدر انجمن ترقی اردو جمشید پور نے کی اور ٹاٹا اسٹیل کارپوریٹ کمیونیکیشن کے سربراہ سنجے چودھری نے تقریب کا افتتاح کیا۔ اس جلسے میں آل انڈیا پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری علی جاوید مہمان خصوصی اور کریم سٹی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد زکریا اور اے پی آر نائر مہمان اعزازی کے طور پر شریک تھے۔

انور ادیب نے مجتبیٰ حسین کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زکریا نے انھیں شال اور کیسۂ زر پیش کیا۔ اشعر نجمی نے اپنے مضمون میں کہا کہ لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے کبھی کبھی سوئی چبھونی پڑتی ہے۔ انا کے غبارے کو بھی زمین پر لانے کے لیے سوئی چبھونا ضروری ہوتا ہے اور مزاح کے پردے میں مجتبیٰ حسین بڑی خوبی سے سوئی چبھونا جانتے ہیں۔ ان کی تحریر کبھی گدگداتی ہے تو کبھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے کہا کہ آج کل کتنی کوشش اور سفارش کے بعد اعزاز حاصل کیا جاتا ہے، یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ اعزاز مجھے محبت سے ملا ہے۔ چھمن جیسا شخص ہر شہر میں ایک مل جائے تو اردو کے فروغ کے ساتھ قومی یک جہتی کو بڑھاوا ملے گا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے مضامین سنائے اور محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اس موقع پر پرنسپل ڈاکٹر زکریا، پروفیسر افسر کاظمی اور جاوید انور نے بھی خطاب کیا۔ پروفیسر احمد بدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ یوسف یکتا سکندرآباد کے کہنہ مشق بزرگ شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں حمد، نعت، غزل، نظم (پابند) وغیرہ تمام اصناف ملتی ہیں۔ آپ کے دو مجموعے ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ سکندرآباد کی ادبی انجمنوں کے علاوہ آپ حیدرآباد کی بھی بیشتر ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ 26 مارچ کی شام اردو ہال حمایت میں ان کا جشن منایا گیا۔ ادبی اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کی۔ مہمانانِ خصوصی و مقررین میں جناب صلاح الدین نیر، پروفیسر میر تراب علی، ڈاکٹر سید بشیر احمد، ڈاکٹر محسن جلگانوی، ڈاکٹر محمد منشا اللہ ثانی، نادرالمدوی اور قاضی فاروق عارفی شامل تھے۔ ادبی اجلاس شاغل ادیب نے تہنیتی نظم ''جشن حضرت یوسف یکتا پر'' سنائی۔ ادبی اجلاس کے بعد منعقدہ مشاعرہ کی صدارت حضرتِ یوسف یکتا نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں جناب اثر غوری، ڈاکٹر محسن جلگانوی اور شوکت علی درد شامل تھے۔ صلاح الدین نیر، شاغل ادیب، قاضی فاروق عارفی، قدیر انصاری، نادرالمدوی، شکیل مظہر، الیاس مطیعی اور دیگر شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ ادبی اجلاس میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ بزرگ اہل قلم کی خدمات کے احترام کا جذبہ قابلِ صد ستائش ہے۔ پروفیسر میر تراب علی نے کہا کہ حضرتِ یکتا ایک معتبر وضعدار بزرگ شاعر ہیں۔ ڈاکٹر سید بشیر احمد نے کہا کہ حضرت یوسف یکتا کو اپنے ابتدائی دور میں حیدرآباد کے استاد شعرا کی محبت حاصل رہی جس نے انھیں خود بھی استاد شاعر بنا دیا۔ جناب نادر المدوس نے کہا کہ مجھے ان کی مذہبی شاعری نے بے حد متاثر کیا۔ ڈاکٹر محسن جلگانوی ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ثانوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی سے خواہش کی کہ وہ اس بزرگ شاعر کے رقمی امداد کا اہتمام کرے۔ یہ خوشگوار تقریب، حضرتِ یکتا کے اظہار تشکر پر اختتام کو پہنچی۔ (ڈاک سے)

مشاعرہ

ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں
تہذیب کی تقسیم نہیں ہو سکتی

نئی دہلی۔ 11 اپریل۔ جشن بہار ٹرسٹ نئی دہلی اور انڈین کاؤنسل کلچرل سینٹر کے زیر اہتمام دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ میں 10ویں مشاعرہ "جشن بہار" کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن اور نظامت ڈاکٹر مہدی جعفری نے کی۔

مشاعرہ رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے اختتام پذیر ہوا۔ باذوق سامعین نے بیرونی اور مقامی شعرا کو ان کے کلام پر داد و تحسین سے نوازا۔ مشاعرے میں شریک شعرا کا منتخب کلام پیش ہے:

آئین تو ہم روز بدل سکتے ہیں
اخلاق میں ترمیم نہیں ہوسکتی
ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں
تہذیب کی تقسیم نہیں ہوسکتی
گلزار دہلوی

میں اک زمانے سے حیران ہوں کہ حاکمِ شہر
جو ہورہا ہے اسے دیکھتا نہیں ہے کیا
شہریار

خوف کے سائے میں بچے کو اگر جینا پڑا
بے زباں ہوجائے گا یا بدزباں ہوجائے گا
وسیم بریلوی

تم نے دوران تکلم یونہی اک نام لیا
ہم کو اس نام پہ کیا جانیے کیا یاد آیا
صبیحہ صبا

ایک دریا ہوں مگر پیاسا رہا ہوں عمر بھر
سوچتا ہوں اب سمندر میں اتر جاتا ہوں میں
چانگ شی سوان (انتخاب عالم)

وہ لمحہ جب مرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت ہوئی
حمیرہ رحمٰن

کر جاتے ہو کوئی شرارت چپکے سے
چلو، ہٹو، تم بہت برے ہو، تم بھی نا
عنبرین حسیب

کیا خبر کوئی فرشتہ ہو بشکل انساں
گھر پہ آئے ہوئے سائل کو نہ ٹالا جائے
آغا سروش

تول کر دیکھ لے عظمت کے ترازو میں اسے
میری چادر تری دستار سے بھاری ہوگی
نصرت مہدی

غنیمت ہے نگر والو لٹیروں سے لٹے ہو تم
ہمیں تو گاؤں میں اکثر داروغہ لوٹ جاتا ہے
آلوک شریواستو

اس موقع پر گوہر رضا نے "شدت پسند جستجو" اور "میں چاہتا ہوں" کے عنوان سے نظمیں پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ جدہ سے آئے عمر عالم مضار العدروس نے اردو کے تعلق سے اپنی نظم پڑھی جبکہ برطانیہ کے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے اردو کے نامور شعرا کے کلام کا منظوم انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ دیگر شعرا میں مہدی جعفری، جانی فاسٹر، اعجاز پاپولر، مسرور جاوید، سجاد جھنجھٹ، انجم رہبر وغیرہ شامل تھے۔ (صحافت، دہلی)

کہیں پہ جسم کہیں پہ خیال رہتا ہے
محبتوں میں کہاں اعتدال رہتا ہے

● علی گڑھ۔ 9 اپریل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج آڈیٹوریم میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ممتاز شاعر پروفیسر شہریار نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ مشاعرے کے آغاز سے قبل خطبۂ استقبالیہ میں پروفیسر ماریہ بلقیس نے مشاعروں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کے امین ہیں، ان سے ہمارا بہت ہی قدیم رشتہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہاں یہ مشاعرہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے تاکہ ہماری طالبات کی ذہنی ترقی ہو، ان میں ادبی و ثقافتی شعور بیدار ہو اور وہ عصری شعری سرمائے سے واقف بھی ہوسکیں۔ مشاعرے میں علی گڑھ کے علاوہ ملک اور بیرونِ ملک کے شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ پیش ہیں چند منتخب اشعار:

کیا کیا ہمارے قتل پہ جشنِ طرب ہوا
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ قصہ یہ کب ہوا
فاطمہ وصیہ جائسی

ترک محبت اپنی خطا ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے
وہ اب بھی پابندِ وفا ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے
ملک زادہ منظور

یہ جہاں خوب ہے سب اس کے نظارے اچھے
اس سے بڑھ کر ہیں اسے چاہنے والے اچھے
مہتاب حیدر نقوی

بظاہر جو نظر آتے ہو تم مسرور ایسا کیسے کرتے ہو
بتانا تو سہی ویرانیِ دل کا تماشہ کیسے کرتے ہو
سراج اجملی

جانا تو مرا طے ہے مگر یہ نہیں معلوم
اس شہر سے میں آج چلا جاؤں کہ کل جاؤں
مخمور سعیدی

میرے ساتھ لگا رہتا ہے یادوں کا بادل
دھوپ بھرے رستوں پر اس نے سایہ چھوڑ دیا
عبید صدیقی

ریت پر اک نشان ہے شاید
یہ ہمارا مکان ہے شاید
مظفر ابدالی

کہیں پہ جسم کہیں پر خیال رہتا ہے
محبتوں میں کہاں اعتدال رہتا ہے
عالم خورشید

نہ کوئی قافلۂ شوق نہ منزل کا نشاں
دور تک ریگِ رواں ریگِ رواں ریگِ رواں
پروفیسر زاہدہ زیدی

پہلے تو چھین لی مری آنکھوں کی روشنی
پھر آئینے کے سامنے لایا گیا مجھے
شاہد میر

سب کے جیسے نہ بنا زلف کہ ہم سادہ نگاہ
تیرے دھوکے میں کسی اور کے شانے لگ جائیں
فرحت احساس

چپ گزر جاتا ہوں حیران بھی ہو جاتا ہوں
اور کسی دن تو پریشان بھی ہو جاتا ہوں
شہپر رسول

آسماں کچھ بھی نہیں اب ترے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لیے
شہریار

ان کے علاوہ ام ہانی اشرف، دردانہ قاسمی، تابش مہدی، انجمن آرا انجم، ناہید رضوی، بیگم افتخار صدیقی، ضیا فاروقی اور زویا زیدی نے بھی کلام سنایا۔
(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

دماغ و دل ہیں دونوں ایک گھر کے
نہ جانے ان میں کیوں ان بن بہت ہے

● نوئیڈا۔ 5 اپریل، ''ایک شام پدم شری بیکل اتساہی کے نام'' سے ایک مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کربھکو بھون کے آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ ہندی روزنامہ ''چینی خبر'' اور باوا ایلڈ میٹ کے اشتراک سے منعقد اس تقریب میں مختلف شخصیات نے بیکل اتساہی کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ آرگنائزرس کی جانب سے صاحب اعزاز کی خدمت میں ڈیلو کار کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف تنظیموں کی جانب سے بھی بیکل اتساہی کو تحائف اور سپاسنامے پیش کیے گئے۔ اس تقریب میں زی نیوز کے ایڈیٹر ان چیف ستیش کے سنگھ مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر ایسوٹیک لمیٹڈ کے چیئرمین سنجیو شری واستو بھی موجود تھے اور انھوں نے پروگرام کے پہلے حصے کی صدارت کی۔ مشاعرے کی صدارت گلزار دہلوی اور نظامت منصور عثمانی نے کی۔ منتخب اشعار قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش ہیں:

دماغ و دل ہیں دونوں ایک گھر کے
نہ جانے ان میں کیوں ان بن بہت ہے
بیکل اتساہی

مئے انگور پلا دے ساقی، شعلۂ طور پلا دے ساقی
حوضِ کوثر سے منگا کر مجھ کو، نور ہی نور پلا دے ساقی
گلزار دہلوی

خوف کے سائے میں بچے کو اگر جینا پڑا
بے زباں ہو جائے گا یا بدزباں ہو جائے گا
وسیم بریلوی

گھر نہیں ہوتا چھتوں سے اور در و دیوار سے
دو پرندے شاخ پر بیٹھیں گے، گھر ہو جائے گا
شکیل شمسی

صحراؤں کے نصیب میں صدیوں سے ریت ہے
دریا تو بہتے بہتے سمندر کے ہوگئے
منصور عثمانی

رستہ تکتے رہ جاتے ہیں شب کے چراغ
رات سحر کے زینے چڑھنے لگتی ہے
نسیم نکہت

کسی پہ مٹنے مٹانے سے فائدہ کیا ہے
مزہ تو جب ہے کسی کے لیے جیا جائے
عقیل نعمانی

پڑھ متین ایسی غزل کوئی سر بزم سخن
رقص بسمل بزم میں ہو وجد میں آنے کے بعد
متین امروہوی

جیتنے والے تجھے مات بھی ہوسکتی ہے
آج کل دھوپ میں برسات بھی ہوسکتی ہے
ملک زادہ جاوید

نام لے کر ترا چلتے رہے تنہا تنہا
ٹھوکریں کھا کے سنبھلتے رہے تنہا تنہا
رشمی سانن

پہلے بھولے کیسے یہ گونگی محبت
نہ وہ بولتے ہیں نہ ہم لتے ہیں
شرف نانپاروی

ان کے علاوہ اشوک چکردھر، پاپولر میرٹھی، کنور بے چین، اتل بیتاب، کلہڑ مود ہویا اور سجاد جھنجھٹ، حسن کاظمی، معین شاداب، افضل منگلوری، فصیح چودھری اور کچھ دیگر شعرا نے بھی کلام پیش کیا۔ کنوینر شاہد خاں نے تمام شرکا اور معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تمہیں ساحل پہ موجوں کی پڑی ہے
مرے ہاتھوں سے دریا جارہا ہے

● نئی دہلی۔ 13 اپریل، دہلی کی ادبی تنظیم ''میزان'' کے زیراہتمام امریکا اور پاکستان سے آئے مہمان شعرا کے اعزاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں شعری نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی جبکہ نظامت کے فرائض میزان کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے انجام دیے۔ آغاز میں ڈاکٹر شہزاد انجم نے مہمانوں کا استقبال اور ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ملک سے باہر رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا ایک اہم بات ہے جبکہ اردو آج اردو والوں کے گھروں سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ شعرائے کے منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

تلاطم خیز موجوں سے بھی تو نے کچھ نہیں سیکھا
تجھے رونا بھی میری چشم تر اب تک نہیں آیا
خالد محمود

تمہیں ساحل پہ موجوں کی پڑی ہے
مرے ہاتھوں سے دریا جارہا ہے
مسرور جاوید (امریکا)

کسی صلے کی جو چاہ ہوتی تو میں بھی شاید
ہر ایک مسند نشیں کو عالی جناب لکھتا
ماجد دیوبندی

میر مجلس یونہی رہنے دے مرے دلبر کو
ہاں مری بزم تصور کو سجا رہنے دے
ڈاکٹر صبیحہ صبا (امریکا)

زمین ہند و پاکستان کے دکھ ایک ہیں تو پھر
تضادِ گفتگو کیسا یہ جڑواں بھائیوں میں ہے
حمیرہ رحمان (امریکا)

تعلق جو بھی رکھو سوچ لینا
کہ ہم رشتہ نبھانا جانتے ہیں
عنبرین حسیب (پاکستان)

خرد کی رہنمائی نے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا
جنوں کو رہنما کرتے تو نقشہ دوسرا ہوتا
تابش مہدی

آیا تھا عشق میرے پاس مانگنے روح کا لباس
میں نے عطا کیا اسے اپنا بدن اتار کے
فرحت احساس

پہلے رہتے تھے مکانوں میں بڑے چین سے لوگ
اور اب ذہن میں لوگوں کے مکاں رہتے ہیں
سریندر شجر

کب کھلیں گی مری تری آنکھیں
کب کوئی خواب معتبر ہوگا
مشتاق صدف

گھر کی دیواریں ہوگئیں اونچی
تم نے باہر کا خواب دیکھا کیوں
انور باری

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایک چہرہ تصویر سے باہر لانے کو
اچھے خاصے منظر کاٹنے پڑتے ہیں

● نوئیڈا۔ 14 اپریل، نوئیڈا کے سلور سٹی میں ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جشن بہار مشاعرے کی بنیاد گزار کامنا پرساد نے شرکت کی اور صدارت حمیرا رحمٰن نے کی جبکہ نظامت طالب زیدی نے انجام دی۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں۔

اک چہرہ تصویر سے باہر لانے کو
اچھے خاصے منظر کاٹنے پڑتے ہیں
حمیرا رحمٰن (امریکا)

میں تو اک سبزۂ خودرو ہوں مجھے کیا ڈر ہے
جتنا کاٹا گیا اتنا ہی مرا سر نکلا
فرحت احساس

ہم تو سنتے ہیں کہ مل جاتے ہیں بچھڑے ہوئے لوگ
وہ جو بچھڑا ہے تو کیا وقت نے گردش نہیں کی
عنبریں حسیب عنبر (پاکستان)

تخلیق ایسا شعر کریں ہم بصد کمال
جو سب کے دل کی بات ہو جس کو نہ ہو زوال
عمر سالم العیدروس (سعودی عرب)

نئے عذاب ہمارے لیے اتارے جائیں
گناہ ایسے کہاں اگلی امتوں سے ہوئے
ڈاکٹر ایم آر قاسمی

گم ہوئے رستے میں تو رستہ بھی پوچھا نہیں
مڑ کے اپنے سائے کی جانب بھی دیکھا نہیں
ہمایوں ظفر زیدی

وہ پیاس ہے کہ سمندر بھی کم ہے میرے لیے
یہ کم نہیں کہ تری آنکھ نم ہے میرے لیے
طالب زیدی

ہر ایک شخص ہے جم غفیر میں کھویا
ہر ایک موڑ پہ تنہائیاں بھی رکھی ہیں
وسیم راشد

ہوا کو ضد تھی کہ ہم کو ہی شوق تھا اتنا
چراغ بجھتے رہے اور ہم جلاتے رہے
حیدر زیدی

گزری تھی زندگی کی کڑی دھوپ اس کے ساتھ
رات آ گئی مگر وہ اجالا نہیں گیا
امیر زیدی فرخ (دبئی)

بدن پہ جینس اردو کی، گلے میں ٹائی اردو کی
کہ ساری عمر کھائی ہے فقط بالائی اردو کی
پروفیسر یہ اردو کے جو اردو سے کماتے ہیں
اسی پیسے سے بچوں کو یہ انگریزی پڑھاتے ہیں
احمد علوی

ہم جیسے ہیں سب کچھ ویسا ہوتا ہے
ہر چشمے کا اپنا چہرہ ہوتا ہے
ناظم نقوی

زمین پاؤں میں اور سر پہ آسمان لیے
بھٹک رہا ہوں میں اتنا بڑا مکان لیے
انور رضوی

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ

● نئی دہلی۔ 23 مارچ، ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم میں ڈاکٹر مولا بخش کی کتاب ''جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' کا اجرا عمل میں آیا جس کی صدارت مظہر امام نے کی اور پروفیسر وہاب اشرفی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ اس کتاب میں جدید ادبی تھیوری کے ساتھ ساتھ گوپی چند نارنگ کی تنقیدی بصیرت اور دانشورانہ افکار و میلانات پر مولا بخش نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے گوپی چند نارنگ کو مابعد جدیدیت کا امام قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کی پوری فضا بدل چکی ہے۔ وہ لوگ جو سماجی قدر یا تاریخ کو ادب کے باہر کی چیز سمجھتے تھے وہ بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گلوبل فینومینا پر غور کیے بغیر ہم مابعد جدیدیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں کو فقط جدید تھیوری ہی اپنی گرفت میں لے سکتی ہے اور آج کے متعدد ادبا یہ سمجھ گئے ہیں کہ زندگی سے کٹ کر ادب لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ سامعین کے اصرار پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میرا ادبی سفر فقط ادبی سفر نہیں بلکہ سفر عشق ہے اور عشق میں صرف دینا ہی دینا ہوتا ہے، لینا کچھ نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرے مخالفین کا کرم ہے کہ انھوں نے مجھے ہمیشہ بہتر کام کرنے کی ترغیب ذہنی فراہم کی۔ انھوں نے کہا کہ میں منفی باتوں پر سرے سے توجہ ہی نہیں کرتا ورنہ جتنا کام میں نے کیا ہے وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ منفی رویوں کے پیچھے لوگوں کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

مظہر امام نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مولا بخش کی یہ کتاب جدید ادبی تھیوری اور نارنگ صاحب کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔ نظام صدیقی نے کتاب کو ایک روحانی کشف و جذب کا نمونہ قرار دیا اور کہا کہ مصنف نے مقدمے میں ہی تھیوری کے اہم مباحث کو پانی کر دیا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ تھیوری اور گوپی چند نارنگ کی تنقیدی بصیرت کو مولا بخش نے اس طرح اجالا ہے کہ خود ان کا اپنا ویژن کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس موقعے پر فرحت احساس، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر کوثر مظہری نے بھی اظہار خیال

کیا۔ نیشنل اردو فورم کے صدر ڈاکٹر انور پاشا نے تمام مقررین، شرکا اور مہمانوں کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا مطالعہ اساتذہ اور طلبہ کے لیے ناگزیر ہے۔ اس موقع پر کتاب کے پبلشر ایم.ایم.خان نے خصوصی رعایت کا اعلان کیا اور ہاتھوں ہاتھ پچاس ساٹھ کتابیں فروخت ہوگئیں۔ جلسے کے آغاز میں تمام مہمانوں کی گلپوشی بھی کی گئی۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے ساتھ متعدد سرکردہ ادبی شخصیات موجود تھیں۔ (ڈاک سے)

قید ... سلسلے نہ از دل ما

پروفیسر قمر رئیس

● مشہور ترقی پسند نقاد اور شاعر پروفیسر قمر رئیس کا مختصر علالت کے بعد 29 اپریل کو نئی دلی کے بترا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 77 سال کے تھے۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ ایک گود لی ہوئی بیٹی اور داماد شامل ہیں۔ انھیں انتقال سے ایک ہفتہ قبل یرقان بگڑ جانے کے سبب اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔

پروفیسر قمر رئیس کی پیدائش اتر پردیش کے شہر شاہجہانپور میں جولائی 1932 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے 1952 میں گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور سے ہائی اسکول کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ اور علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کیے۔ 1958 میں انھوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی.ایچ.ڈی.کی۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں وہ ماہنامہ ''ادیب'' اور علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی رہے۔ 1959 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے اور پروفیسر کے عہدے تک ترقی حاصل کی۔ پانچ بار انجمن اساتذۂ اردو، جامعاتِ ہند کے جنرل سکریٹری رہے۔ وہ مسلسل 18 سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ UGC نے انھیں نیشنل لیکچرار کے اعزاز سے اور تاشقند یونیورسٹی نے 2001 میں پی.ایچ.ڈی.کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔ وہ تاشقند میں لنگویج ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر بھی رہے۔

پروفیسر قمر رئیس کو زمانۂ طالب علمی سے ہی شعروادب سے لگاؤ تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے اور ان کی یہ وابستگی آخر تک برقرار رہی۔ ان کی لگ بھگ ایک درجن کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کا بنیادی کام پریم چند پر ہے۔ مارکسی تنقید میں ان کا نام نمایاں ہے۔

پروفیسر قمر رئیس کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملتے پر قومی اردو کونسل کے دفتر میں فوراً ہی تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی جس کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس اردو کی محترم ترین شخصیتوں میں تھے اور وہ اندرونِ ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ وہ قومی اردو کونسل کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبر رہے اور گذشتہ تین سال سے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین تھے۔ ان کی وائس چیئرمین شپ کے زمانے میں اکادمی کافی فعال رہی۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے مزید کہا کہ پروفیسر قمر رئیس جس مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے تھے، اس نے اردو شعروادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کی بڑی مؤثر کوششیں کیں جو بارآور بھی ہوئیں اور فکروفن میں تنوع اور تازگی کی ایک نئی فضا قائم ہوئی۔ وہ ایک واضح نقطۂ نظر رکھنے والے نقاد کے ساتھ ساتھ خوش فکر شاعر بھی تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کی شاعری کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا تھا جو اردو شاعری خصوصاً اردو نظم کے سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی

● نئی دہلی۔ 23 اپریل، اردو دنیا میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ پروفیسر ظفر احمد نظامی کا شام 6 بجے اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کا آبائی وطن شیرکوٹ ضلع بجنور تھا۔ 25 نومبر 1933 کو ان کی پیدائش پرتاپ گڑھ میں ہوئی۔ 1959 میں انھوں نے انگریزی ادبیات میں ایم.اے.کیا۔ وہ اجمل خاں طبیہ کالج کے پہلے بیچ کے فارغین میں تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس سے وابستہ ظفر احمد نظامی ایک مورخ اور ماہر سیاسیات کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی کم و بیش ایک درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں حکیم اجمل خاں، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، تاریخ ہند۔ دور جدید، معمارانِ جامعہ، کوثر چاندپوری، اے.پی.جے.عبدالکلام اور سونیا گاندھی اہمیت کی حامل کتابیں ہیں۔ انھوں نے درجنوں قلمی چہرے بھی لکھے ہیں، جو اپنی ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ مرحوم نظامی کی تدفین 24 اپریل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہوئی۔

انور سعید

● علی گڑھ۔ 13 اپریل، جامعہ اردو علی گڑھ کے سابق رجسٹرار سید انور سعید کا آج یہاں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر 55 سال تھی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ 1992 میں جامعہ اردو علی گڑھ کے رجسٹرار ہوگئے اور 13 سال یہ خدمت انجام دی۔ اس مدت میں جامعہ اردو کی توسیع و ترقی کے لیے متعدد اقدامات کیے اور جامعہ

اردو کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور بیرون ملک میں بھی جامعہ اردو کے سینٹر قائم ہوئے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بچے ہیں۔ آج سرسید نگر قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم انور سعید ادبی تقاریب کا اہتمام بھی کرایا کرتے تھے۔ اصلاح معاشرہ کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے سلسلے میں مرحوم انور سعید تنازعات کے گھیرے میں بھی رہے اور ان کے خلاف مقدمات بھی درج ہوئے لیکن مخالف حالات میں بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ادیب و شاعر مرحوم سعید انور سعید کی خدمات کو تا دیر یاد کیا جائے گا۔

اقبال بانو

● لاہور۔ 22 اپریل، ممتاز غزل گلوکارہ اقبال بانو کا منگل کے دن لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وہ 74 برس کی تھیں۔ وہ 1935 میں دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ دہلی گھرانے کے استاد چاند خان کی شاگرد تھیں۔ اقبال بانو 1952 میں پاکستان منتقل ہوئی تھیں۔ ❑❑❑

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کر دی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق، اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔ ''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نئی شعری روایت'' نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت -/127 روپے

تبصرہ وتعارف

جامع تاریخ ہند (عہدِ سلطنت)

مصنفین: پروفیسر محمد حبیب/ پروفیسر خلیق احمد نظامی
صفحات: 1000، سائز ڈیمائی، قیمت: -/306 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: محمد معظم الدین، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی-16

اس کتاب کی شانِ تصنیف یہ ہے کہ 1940 میں انڈین ہسٹری کانگریس نے اپنے لاہور سیشن میں جدید ترین تحقیقات پر مبنی ہندوستان کی تاریخ کو بارہ جلدوں میں پیش کرنے کا ایک جامع منصوبہ اس لیے بنایا تھا کہ تاریخ کے طالب علموں کے لیے حوالے کے طور پر کام آسکے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس کا خاکہ انڈین ہسٹری کانگریس کمیٹی نے 1943 میں علی گڑھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت 1984 میں ہوئی تھی۔ اس کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر اسے 2001 میں دوبارہ شائع کیا گیا۔ اس کتاب کے مصنفین نہ صرف اپنے عہد کے نامور مورخین میں شمار کیے جاتے تھے بلکہ آج بھی تاریخ کے موضوع پر ان کی کتابیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں اسلام کے عروج سے لے کر بابر کے عہد تک ہندوستانی تاریخ اور ہندوستان کے شمال مغرب کے ممالک کی تاریخ کے ارتقا کو وسیع تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں دہلی سلطنت کے ہر شاہی خاندان کے لیے ایک ایک باب وقف ہے ساتھ ہی علاقائی سلطنتوں کے احوال کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ ہر باب کو مزید ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نیز ذیلی عنوانات کی حسبِ ضرورت مزید سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ اس طرح وضاحت در وضاحت سے مواد کی پیش کش بہ خوبی ہوگئی ہے۔ اس جلد کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ ماضی کے واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کر کے آئندہ جلدوں کے لیے تحقیق کی راہ ہموار کی جاسکے لیکن اختصار کے باوجود یہ کتاب ایک ہزار صفحات کو محیط ہے۔ اس میں تمام اہم واقعات کا عطر کشید ہو کر آ گیا ہے۔

تعارف اور دیباچے کے علاوہ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''ایشیائی ماحول'' کے عنوان سے ہے جو عہدِ سلطنت کے لیے تعارف اور پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ تقریباً دو سو صفحات کو محیط ہے اور چھے ذیلی عنوانات — مسلمانوں میں بادشاہت اور طبقۂ امرا کی ابتدا، خوارزمی سلطنت، چنگیز خاں کا عروج، عجم پر منگول حملہ، قاآن اور منگول اولوسات اور امیر تیمور — میں منقسم ہے۔ اس میں اسلام سے قبل عرب کی صورتِ حال آنحضرتؐ کا حفاظتی نظام، اموی سلطنت، خلافتِ راشدہ، اموی عباسیہ اور غزنوی اور سلجوقی مملکتیں، ذہنی سماج، چنگیز خاں کا کردار، اس کی شخصیت اور پالیسی، بخارا اور سمرقند کی تباہی، منگولوں کے ذریعے غور کی فتح، منگولوں پر مصری فتح، مغربی ایشیا کے اوکتائی چغتائی حکمراں، تیمور کی کامیابی کے اسباب اور اس کی مختلف مہمات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب ''دہلی سلطنت کی بنیاد'' سے متعلق ہے۔ ترکی حملوں کے وقت ہندوستان کی حالت، غور کی تاریخ، سلطان معزالدین کی ہندوستانی مہمیں، شمالی ہندوستان کی فتح اور ترکی تسلط کی اہمیت اس کے مزید ذیلی عنوانات ہیں۔ ان میں غوریوں کی فتح سے پہلے مسلم آبادیات، مولانا رضی الدین حسن، شیخ حمیدالدین صوفی ناگوری، ترائن کی جنگ، ملک بہاء الدین، محمد بختیار خلجی، معزالدین کا قتل اور ترکوں کی کامیابی کی وجوہات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب ''دہلی کے ابتدائی ترکی سلاطین'' کے لیے وقف ہے۔ اس کے پانچ ذیلی عنوانات ہیں جن میں سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التتمش، اس کے وارثین، سلطان ناصرالدین محمود اور سلطان بلبن اور کیقباد وغیرہ کے حالاتِ زندگی، ان کی فتوحات و مشکلات، ان کے وارثین اور ان کی اصلاحات وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ''خلجی خاندان'' سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے مزید نو حصے کیے گئے ہیں۔ ان میں جلال الدین فیروز خلجی کی تخت نشینی، اس کی عسکری مہمات، اس کا قتل، سیدی مولا کا معاملہ، علاء الدین خلجی کا حصولِ اقتدار، مال گزاری میں اس کی اصلاحات، اس کے معاشی ضوابط، آخری منگول حملے، مالوہ، سوانہ اور جالور کی فتح، اسماعیلی بوہروں کی سرزنش، وارنگل کی مہم، علاء الدین خلجی کے آخری سال، ملک کافور کی حکومت، قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے انتظامات، دیوگیری اور وارنگل پر حملہ، مبارک کی تخت گیری، سلطان اور شیخ نظام الدین اولیاؒ، سلطان کا قتل، خسرو خاں کی تخت نشینی اور اس کی مختلف جنگوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کا سب سے طویل باب ہے اور 236 صفحات پر مشتمل ہے۔

چھٹے باب میں ''سید خاندان'' کے افراد کو جگہ دی گئی ہے۔ اس میں خضر خاں، مبارک شاہ اور مبارک شاہ کے جانشین وغیرہ کے حالاتِ زندگی، انتظامی امور، ان کی مہمات، فتوحات، بغاوتیں اور کش مکش وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا ساتواں اور آخری باب ''لودی خاندان'' کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس میں تعارف کے بعد بہلول لودی، سلطان سکندر لودی اور ابراہیم لودی کے اقتدار، انتظامی امور، علاقائی حکمرانوں کے ساتھ ان کی کشمکش، مہمات، سازشیں، بابر کو دعوت اور پانی پت کی جنگ جیسے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف تاریخ کے طالب علموں کے لیے بلکہ تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے عام قارئین کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ عرصے سے یہ کتاب ہندوستانی جامعات کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اسے دوبارہ شائع کر کے ایک اہم علمی فریضہ انجام دیا ہے۔

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف: گوپی چند نارنگ

صفحات: 364، قیمت: 200/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: رغبت شمیم، E-122، برہم پتر ہاسٹل، جے.این.یو. نئی دہلی-67

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے ممتاز محقق اور ناقد ہیں۔ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' ان کی اولین تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1959 میں اور دوبارہ 1961 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے تیسری بار شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر پروفیسر نارنگ کو 1962 میں ''غالب ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔ اردو کے مشہور محققین اور ناقدین — مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، مسعود حسن رضوی ادیب اور گیان چند جین اسے اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب قرار دے چکے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں: ''یہ بات افسوس ناک ہے کہ اردو مثنوی پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صنف سخن پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی، وہ مثنوی ہی ہے۔ غزل پر تو ان چند برسوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے گئے ہیں، لیکن مثنوی کا کوئی پرسان حال بھی نہیں۔ امیر احمد علوی نے ''مثنویات'' پر ایک مقالہ 1935 میں ''نگار'' کے لیے لکھا تھا۔ یہی بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ عبدالقادر سروری کی کتاب ''اردو مثنوی کا ارتقا'' بھی تقریباً بیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جلال الدین جعفری کی کتاب ''تاریخ مثنویات اردو'' کے نام سے دوبار شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت تاریخی اور تحقیقی نہیں۔ اس میں زیادہ توجہ مشہور اردو مثنویوں کا انتخاب پیش کرنے پر صرف کی گئی ہے۔''

آل احمد سرور کے الفاظ میں ''اردو مثنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش اور تحقیق سے اردو مثنویوں کی ہندوستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے ان نوادر کو جو نظروں سے اوجھل تھے، یکجا کر کے ایک داستان مرتب کی ہے جس میں معلومات کے ساتھ دل کشی بھی ہے۔''

''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' 364 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے باب اول میں انھوں نے پورانک قصوں کو جگہ دی ہے۔ پورانک قصوں سے مراد وہ قصے ہیں جن کا تعلق مہابھارت، رامائن اور پرانوں سے ہے۔ ان میں اردو میں زیادہ تر نل دمینتی، دُشینت اور شکنتلا، ستیہ وان اور ساوتری کے قصے نظم کیے گئے ہیں۔ ساوتری کی کہانی پر ایک، شکنتلا پر چار اور نل دمینتی پر چھے مثنویاں اردو میں ملتی ہیں۔ مصنف نے ان مثنویوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

باب دوم لوک کہانیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ذیل میں وہ قصے کہانیاں آتی ہیں جو عوامی روایتوں یا علاقائی زبانوں میں مقبول عام ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے ان قصے کہانیوں میں پنج تنتر، شک سپ تتی، بیتال پچیسی، کتھا سرت ساگر جاتک کہانیوں وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ یہ ''لوک کہانیاں'' دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصے میں انھوں نے دکنی مثنویات مثلاً کدم راؤ پدم راؤ، طوطی نامہ، مینا ستونتی، منوہر اور مدھو مالتی، عود وصندل، نیہ درپن اور کامروپ وکلا کام سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں شمالی ہند کی اہم مثنویوں سنگھاسن بتیسی، راجا جلوان مل و چتر سین، قصہ کنور و چندر کرن، راجا چتر مکٹ اور رانی چندر کرن، قصہ راجا گوپی چند اور قصہ راجا کنور سین و رانی چتر اولی کا جائزہ لیا ہے۔

باب سوم کا عنوان ''نیم تاریخی قصے'' ہے۔ اس میں ان قصے کہانیوں کو جگہ دی گئی ہے جو عوامی روایتوں میں حقیقی تصور کی جاتی ہیں یا جن کا تعلق کسی تاریخی واقعے سے ہے۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، پدماوت، سوہنی مہیوال، بدھو گل فروش، قطب مشتری، چندر بدن و مہیار، ندرت عشق، مغل اور ناگری، طالب و موہنی، بہلول صادق، شعلۂ شوق، سوز و گداز، مثنوی دل پذیر اور مثنوی سراپا سوز وغیرہ کو اسی زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ مصنف نے ان مثنویوں کا بہترین تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔

''ہند ایرانی قصے'' اس کتاب کا باب چہارم ہے۔ اس باب میں ان مثنویوں کا ذکر ہے جن میں ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں کے قصے کہانیوں کی آمیزش ہے۔ ان میں دونوں ملکوں کے تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی رنگوں کی یکجائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مثنویوں کو نہ تو خالص ہندوستانی

کہا جاسکتا ہے اور نہ خالص ایرانی۔ اردو میں اس قسم کی متعدد مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ دکنی مثنویوں میں ''پھول بن''، دہلوی رنگ کی مثنویوں میں ''سحرالبیان'' اور لکھنوی مثنویوں میں ''گلزار نسیم'' اسی قسم کی مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں کا تہذیبی مطالعہ کرتے وقت مصنف نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ قصے کے مختلف اجزا کی کیفیت پوری طرح روشن ہوجائے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' مثنوی کی تحقیق پر سب سے جامع کتاب ہے اور بیک وقت طلبہ، اساتذہ دونوں کے لیے قابل مطالعہ ہے۔ کتاب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوبصورت اور قابل تحسین ہے۔

معالجات

مصنف: حکیم وسیم احمد اعظمی

صفحات: 457، قیمت: -/73 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: نعمان انور-01، ابن بطوطہ ہاسٹل، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت کے علاوہ مختلف علوم وفنون، حکمت وفلسفہ، منطق وریاضی، سائنس اور دیگر زبانوں کے تراجم پر مبنی کتابیں بھی شائع کرتی رہی ہے۔ حکیم وسیم احمد اعظمی کی تصنیف ''معالجات'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو فن طب سے متعلق ہے۔ اس تصنیف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کی تیاری میں بڑی عرق ریزی کی ہے اور یونانی طریقۂ علاج سے متعلق عربی اور فارسی کی اہم کتابوں کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کیا ہے۔ مزید برآں ایلوپیتھی کی انگریزی تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایلوپیتھی مصنف کے طریقۂ علاج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن تجویز ادویہ کے لیے یونانی طریقۂ علاج ہی اختیار کیا ہے۔

حکیم وسیم احمد اعظمی نے جسمانی امراض کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور تینوں حصوں کی جزئیات پر الگ الگ روشنی ڈالی ہے۔ مرض کی تشخیص کے بعد اس کے اقسام، اسباب، علامات، اصول علاج اور طریق علاج کا ذکر کیا ہے۔ حصۂ اول ''امراض نظام اعصاب'' کے بیان میں ہے۔ اولاً نظام اعصاب کی تشریح اور اعصاب کے افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظام اعصاب کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ان کی جزئیات کی تفصیل بیان کی ہے۔ بعد ازاں اصول علاج اور دفع مرض کے لیے نسخے تحریر کیے گئے ہیں۔ پہلا حصہ 252 صفحات پر مشتمل ہے جو اپنے آپ میں ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا حصہ ''امراض نظام دوران خون'' کے عنوان سے ہے جسے انگریزی میں Circulatory System کہتے ہیں۔ بقول حکیم وسیم احمد اعظمی ''اس نظام کے تحت روح حیوانی تمام جسم میں پہنچتی ہے اور بقائے حیات کا باعث بنتی ہے۔'' نظام دوران خون کو حکیم صاحب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قلب، عروق دمویہ، دونوں کی تشریح کے بعد امراض کی نوعیت اور ان کے علاج کے طریقے بتائے ہیں۔ یہ حصہ 103 صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ ''امراض نظام تنفس'' ہے۔ جسمانی امراض میں ایک موذی و مہلک مرض نظام تنفس میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔ انسانی جسم کی بقا کے لیے تنفس کا اہم کردار ہے۔ نظام تنفس پر موسم، عمر اور ماحول اثر انداز ہوتا ہے جس کے باعث جسم متاثر ہوتا ہے اور اعضا کی کارکردگی میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ حکیم صاحب نے اعضائے تنفس کے نظام اور اس کی کارکردگی کی وضاحت کرتے ہوئے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں علاج کے طریقے تحریر کیے ہیں۔ یہ حصہ 82 صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کی غرض وغایت یہ ہے کہ طب کے طلبہ واساتذہ کو کسی قدر سہولت بہم پہنچائی جائے اور وہ اس سے استفادہ کریں۔ اس مقصد کے لیے زبان آسان استعمال کی گئی ہے لیکن طبی اصطلاحات کو برقرار رکھا گیا ہے۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے۔ تشخیص امراض وعلاج کی تفصیل پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں دو صفحے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد انتساب او رحکیم وسیم احمد اعظمی کا لکھا ہوا دو صفحے کا ابتدائیہ ہے۔ آخر میں پانچ صفحوں پر منابع ومصادر کی تفصیل دی گئی ہے۔

کائنات علی باقر

مرتبین: ڈاکٹر علاء الدین خاں، نسیمہ تراب الحسن

صفحات: 240، قیمت: -/250 روپے

ناشر: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ (یوپی)

مبصر: شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ-800005

اردو میں 1960 کے بعد کا زمانہ جدیدیت کا ''عہد شباب'' کہلاتا ہے۔ اس عہد میں جدیدیت کے زیر اثر زیادہ تر افسانہ نگاروں نے تجریدی کہانیاں لکھنا باعث فخر سمجھا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس رجحان کی وقتی مقبولیت اور افسانے میں کہانی پن کے راز سے واقف تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اہم نام علی باقر کا ہے۔ جو ناقدین فن کی بے توجہی کا شکار رہا۔ علی باقر یورپ میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے اس قسم کے رجحانات سے زیادہ آشنا تھے۔ ان کا مزاج کسی تحریک یا رجحان کی پابندیوں سے آزاد رہ کر ادب کی تخلیق کرنے

والے تخلیق کار کا رہا۔ اس لیے ان کے افسانوں کا سرا نہ تو ترقی پسند تحریک سے مل سکا اور نہ ہی انھوں نے جدیدیت کا کوئی اثر قبول کیا۔ علی باقر نے ان دونوں کے درمیان سے اپنے لیے ایک معتدل راہ نکالی جس میں سماجی حقیقت نگاری بھی تھی اور فنی و جمالیاتی حسن بھی۔ ان کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کہانی میں کہانی پن کا عنصر ہر حال میں برقرار رہنا چاہیے اور کہانی فنی جمالیات کے ساتھ پیش ہونی چاہیے۔ ان کے فکر وفن پر جیسی گفتگو ہونی چاہیے تھی ان کی زندگی میں ہو سکی اور نہ ہی ناقدین نے ان کے فن کا معیار متعین کرنے کی کوئی کوشش کی۔ قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر علاء الدین خاں اور نسیمہ تراب الحسن جنھوں نے نام ونمود سے بے پروا ہو کر فن سے محبت کرنے والے اس فنکار کو دنیائے ادب سے پوری طرح متعارف کرانے کے لیے زیر نظر کتاب ''کائناتِ علی باقر'' ترتیب دی ہے۔ یہ کتاب علی باقر کی زندگی میں شائع ہوئی ہوتی تو شاید انھیں لوگوں کی بے اعتنائی اور عدم توجہی کا شکوہ کم ہوتا۔

کتاب کے مرتبین میں نسیمہ تراب الحسن، علی باقر کی بہن ہیں اس لیے علی باقر کو کتنا جانتی ہوں گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر علاء الدین خاں نے علی باقر کی معیت میں کچھ وقت گزارا تھا اس لیے نہ صرف ان کے شب و روز سے واقف ہیں بلکہ ان کے فن اور ادبی قدر و قیمت کا اندازہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف علی باقر پہ لکھی ہوئی اہم تحریروں کو جمع کیا بلکہ نئے مضامین بھی لکھوائے۔ کتاب کی ترتیب و پیش کش جس عمدہ طریقے سے کی گئی ہے اس کے لیے ڈاکٹر علاء الدین اور نسیمہ تراب الحسن کی مساعی داد طلب ہیں۔

''کائناتِ علی باقر'' ڈاکٹر علاء الدین کے تحریر کردہ مقدمے اور سوانحی کوائف کے علاوہ آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں علی باقر کے افسانوی فن پر تقریباً پندرہ مضامین کے علاوہ علی باقر کے دو انٹرویو، دو خاکے، ان کے افسانوی مجموعوں کے اجرا کی روداد، دوستوں کے تاثرات، تین منتخب افسانے اور افسانے کے منصب پر علی باقر کا تحریر کردہ ایک مضمون شامل ہے۔ آخر میں علی باقر کے چند خطوط ہیں جو انھوں نے اپنی بہن نسیمہ تراب الحسن کو لکھے تھے۔ ان خطوط کی انفرادیت یہ ہے کہ علی باقر نے 1959 سے 2007 تک مسلسل ہر ماہ پابندی سے 23 تاریخ کو انھیں لکھا ہے۔

علی باقر کا افسانوی سفر کم و بیش 44 سال کو محیط ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انگلستان میں گزارا اس لیے وہاں کے معاشرے، طرز بود و باش، مسائل اور تجربات ان کے افسانوں کی بنیادی شناخت ہیں۔ انھوں نے یورپ کو کسی مخصوص نظریے کے تحت نہیں دیکھا بلکہ اپنی نظر سے دیکھا اس لیے ان کے افسانوں میں یورپ اور مغرب کی تصویر سچے اور حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ بظاہر رنگین اور خوبصورت دکھائی دینے والے معاشرے کی وہ تصویر انھوں نے دکھائی جہاں مختلف عمر اور طبقے کے لوگوں کے الگ الگ مسائل ہیں۔ علی باقر نے مغرب کے پوشیدہ نہاں خانوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور وہاں کی تہذیب و تمدن کو کھرے اور اصلی رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔

علی باقر کے چار افسانوی مجموعوں ''خوشی کے موسم''، ''جھوٹے وعدے سچے وعدے''، ''بے نام رشتے''، ''اور مٹھی بھر دل'' کے علاوہ ایک انتخاب ''لندن کے رات دن'' بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناولٹ، ناول اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں اور فلم ٹی وی کے لیے سیریل اور کہانیاں بھی۔ ایسی مختلف الجہات اور رنگارنگ شخصیت سے پوری طرح متعارف کرانے کے لیے ''کائناتِ علی باقر'' جیسی کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ ہمیں ڈاکٹر علاء الدین خاں اور نسیمہ تراب الحسن کا شکرگزار ہونا چاہیے جن کی بے لوث کوشش نے ہمیں علی باقر کو پڑھنے، جاننے اور سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ کتاب مشہور فن کار ایم. ایف. حسین کے خوبصورت آرٹ سے مزین سرورق، عمدہ کاغذ اور صاف ستھری طباعت کی وجہ سے نہایت جاذب نظر ہو گئی ہے۔

ہم کتنے ہاتھوں بکے

شاعر: بھگوان داس اعجاز

صفحات: 128، قیمت: -/100 روپے

ناشر: فانی بک ڈپو، شیا محل، جامع مسجد، دہلی-6

مبصر: معید رشیدی، 142، جہلم، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

دوہا خالص ہندوستانی صنفِ شاعری ہے۔ اس کی روایت بہت پرانی ہے۔ حضرت امیر خسروؒ، کبیر داس، تلسی داس، عبدالرحیم خان خاناں، عبدالقدس گنگوہی، بابا فرید گنج شکر، حاجی علی وغیرہ کے دوہے اکثر سننے میں آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صنفِ شاعری ہے جو فقیرانہ افکار، صوفیانہ تخیلات اور اخلاقی و اصلاحی مضامین کے لیے نہایت موزوں ہے۔ خسرو، تلسی، کبیر یا رحیم نے غنائیت، حظ و نشاط یا فنی برتری کے لیے دوہے نہیں کہے۔ ان کا مقصد تو عوام الناس کو اصلاحی اور اخلاقی درس دینا تھا۔ اگر غور کیا جائے تو ان کے ہر دوہے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی پہلو مل جائے گا۔ دوہے نے سادھوؤں، سنتوں، مرشدوں، درویشوں یا قلندر صفت بزرگوں کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ اس صنف کے توسط سے عصری صداقتوں، آفاقی حقائق اور حیات و کائنات کے رموز کی نقاب کشائی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہوں میں حیات و ممات کے باریک نکتوں کی نشاندہی بڑے تیکھے اور نکیلے انداز میں ملتی ہے۔ اس صنف نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ آج بھی دوہے تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ فراق گورکھپوری، جمیل الدین عالی، ندا فاضلی، نادم بلخی، کرشن موہن، مخمور سعیدی، شین کاف نظام وغیرہ وہ تخلیق کار ہیں جنھوں نے دوہے کی قدیم روایت کو جلا بخشی۔

انھی تخلیق کاروں میں ایک اہم نام بھگوان داس اعجاز کا بھی ہے۔

اردو میں اکثر ایسے شعرا ہوئے ہیں جنھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی شاعری کی۔ دو زبانوں میں شعر کہنے کی روایت پرانی ہے۔ بھگوان داس اعجاز بیک وقت چار زبانوں یعنی اردو، ہندی، پنجابی اور سرائیکی میں شاعری کرتے ہیں۔ شروع میں انھوں نے توفیق تخلص کیا اور مہیش چندر نقش کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ بعد میں ظفر ادیب کے مشورے پر تخلص بدلا اور دوہے کو مستقل طور پر اظہار کا وسیلہ بنایا۔ دوہا ہندی والوں کی جانب سے متروک، ایک حلقے تک محدود اور بھولی بسری صنفِ سخن ہے جسے اردو والوں نے نئی آب و تاب سے ہمکنار کیا۔ اردو والوں کا مزاج غزل سے نہایت آشنا ہے۔ ایک دور تھا کہ شاعری پر لکھتے وقت بات غزل سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھی لیکن اب دیگر اصناف پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔ اردو میں گیت مقبول ہو چکا ہے۔ ماہیہ پنجابی صنفِ شاعری ہے مگر اردو میں بھی اسے وقار حاصل ہوا ہے۔ اردو میں دوہوں کو مقبول بنانے میں جمیل الدین عالی کے بعد بھگوان داس اعجاز کا اہم کردار ہے۔ ان کے دوہوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی داد اہلِ فکر و نظر نے دی ہے۔

اکثر دوہا کہنے والے شعرا ہندی عروض ''پنگل'' سے نابلد ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو میں دوہے فنی لوازمات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ رباعی کی طرح دوہوں کے بھی مخصوص اوزان مقرر ہیں۔ دوہے کے ہر مصرعے میں تیئیس یا چوبیس ماترائیں ہوتی ہیں۔ غزل کے شعر کی طرح دوہا بھی دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن یہ اپنے مخصوص مزاج کا متقاضی ہے۔ غزل کے پیمانے سے دوہے کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ دوہے عام فہم زبان اور ہلکے پھلکے لفظوں میں لکھے جاتے ہیں تاکہ ان کی عوامی مقبولیت پر حرف نہ آئے۔ اعجاز کی زبان بھی عام فہم اور سلیس ہے۔ سلاست، روانی، سادگی، شوخی، شرارت اور طنز کے ساتھ سنجیدگی ان کے دوہوں کی خصوصیات میں ہے۔ ان کا فن ان کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی شعور کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں اخلاقی قدریں غالب ہیں۔ وہ روزمرّہ کے واقعات، واردات اور حادثات کو دوہے کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے دوہوں میں لہجے کی سادگی اور واقعات کا تنوع ہے۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ نیز سیاسی جنگ، پھیلی بدعنوانی اور میڈیا کے فریب پر طنز کرتے ہیں۔ ان کے دوہے حسن و عشق کے تصورات کے بھی غماز ہیں۔ ان کی شاعری تکلفات کے بجائے آمد کا احساس دلاتی ہے۔ چند دوہے ملاحظہ ہوں:

دنیا سے اوجھل رہے، لیا لبادہ اوڑھ
سارے تن پر چھا گیا، من کا کالا کوڑھ

بچہ مرے غریب کا، کوئی نہ کرتا ہائے
کتا مرے امیر کا، سب جگ دوڑا جائے

من دبدھا کے غار میں رین بھئی یا بھور
بھیتر چمگادڑ اڑیں، باہر کاگا شور

لگتا ہے چہرہ مرا، لوگ گئے ہیں بھول
مجھ سے چڑھوائے گئے، میرے بت پر پھول

بھگوان داس اعجاز نے اردو میں دوہوں کو مقبول بنایا۔ ان کے احساسات و جذبات اپنی جڑوں سے وابستہ ہیں۔ ان کے دوہے زمینی حقائق پر مبنی ہیں جن میں خارجیت غالب ہے۔ سطحیت اور عمومیت کی بھی جھلک ملتی ہے۔ امید ہے ''ہم کتنے ہاتھوں بکے'' ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

آنگن میں چاند (افسانوی مجموعہ)

مصنفہ: ڈاکٹر نشاں زیدی

صفحات: 122، قیمت: -/75 روپئے

ناشر: کتابستان، چندواڑہ، مظفر پور، بہار

مبصر: اسد رضا، E-11/47، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی-110017

اردو شعر و ادب کے فروغ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تنقید و تحقیق غرض یہ کہ کسی صنف ادب میں خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ جہاں تک افسانوی ادب کا تعلق ہے تو اردو کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے رشید جہاں، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، بشریٰ رحمٰن، قرۃ العین حیدر، رفیعہ منظور الامین اور ذکیہ مشہدی جیسی افسانہ نگار پیدا کیں جن کا عالمی افسانوی ادب میں بھی قابلِ ذکر مقام ہے۔ افسانوی ادب کے افق پر ابھرتا ہوا ایک نیا نسوانی نام ہے ڈاکٹر نشاں زیدی کا۔ زیرِ نظر کتاب نشاں زیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 18 مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ عزیز برنی صاحب نے کتاب کے آغاز میں ''حرفِ چند'' کے تحت ڈاکٹر نشاں کے افسانوں بالخصوص ''اصلی وارث'' اور ''گاؤں کی لڑکی'' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''افسانہ نگار کی فکر نے معاشرے کی سچائی کو سامنے رکھنے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔'' نشاں زیدی کے بعض افسانے دل کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کچھ افسانوں میں عورتوں کے استحصال، خود غرضی اور لالچ کی عکاسی کی ہے۔ ہندوستانی رسم و رواج اور عقائد کے زیر اثر عموماً خواتین بالخصوص ساس، نند وغیرہ لڑکی کی پیدائش کو بدشگونی سمجھتی ہیں۔ افسانہ ''اصلی وارث'' میں افسانہ نگار نے اسی سچائی کو پیش کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''یہ تو زمانے کا دستور ہی ہے کہ ہر بات کے لیے عورت ہی قصوروار

ٹھہرائی جاتی ہے، بیٹی پیدا ہوئی تو عورت کی غلطی، شوہر کے ڈھنگ صحیح نہیں ہیں تو عورت دوشی اور اسی طرح کے بہت سے مسائل ہیں جن کی ذمے داری صرف عورت کے ہی سر ہے۔''

افسانہ نگار کا تعلق ضلع بریلی کے ایک قصبے سنبھل کے ایک مذہبی گھرانے سے ہے اور وہ خود بھی ذاکرہ ہیں۔ مجالس و محافل میں فضائل و مصائب حضرت محمدؐ آل محمدؐ بیان کرتی ہیں لہٰذا ان کے افسانوں پر مذہب اسلام کا اثر ہونا فطری ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار مذہب پسند اور روایات کا احترام کرنے والے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ ''ٹھوکر'' کا خاص کردار رمیز اپنی اسلام پسند بیوی شیریں کے زیر اثر شراب اور عیاشی سے کنارہ کشی اختیار کر کے نمازی و پرہیزگار بن جاتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں اور قصوں کی یاد آجاتی ہے۔ ترقی پسند خاتون افسانہ نگاروں کے برعکس ان کے افسانوں میں بے باکی، بغاوت، روایت شکنی اور ترقی پسند تحریک سے متاثر فکر و نظر نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کے کسی افسانے کی ہیروئن خواتین کے حقوق، جہیز کی لعنت اور مردوں کے ظلم و ستم کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرتی بلکہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہے۔ تاہم اپنے بعض افسانوں میں نشاں زیدی نے معاشرے میں پھیلی برائیوں، لالچ، خودغرضی، اقدار کشی اور احسان فراموشی وغیرہ کی منظرکشی کی ہے۔ اس قسم کے افسانے یہ توقع پیدا کرتے ہیں کہ مستقبل میں اردو کی یہ نئی افسانہ نگار آئیڈیلزم کی دلکش جنت سے باہر نکل کر حقیقت کے جہنم کی تپش کو بھی محسوس کریں گی۔

نشاں زیدی کے افسانوں کی زبان اور اسلوب عام فہم ہیں۔ وہ مبہم علامتوں کے استعمال سے گریز کرتی ہیں البتہ ادب اسلامی سے نشاں زیدی زیادہ متاثر ہیں اسی لیے ان کے افسانے صالح اقدار اور بدی پر نیکی کی فتح کے حامل ہیں۔

کتاب کا سرورق سادہ نیز عنوان کتاب کے عین مطابق ہے۔ کمپوزنگ اور طباعت کے اعتبار سے بھی ''آنگن میں چاند'' دیدہ زیب ہے۔ توقع ہے کہ افسانہ نگار اردو کو مزید افسانوی مجموعے دیں گی اور زیادہ جرأت کا مظاہرہ کریں گی۔

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دیا ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت-/210 روپے

شکست پندار

مصنفہ: جین آسٹن، مترجم: عبدالعلیم قدوائی

انگریزی کی مشہور زمانہ ناول نگار کے ناول ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈیس'' کا ترجمہ عبدالعلیم قدوائی نے کرداروں کی مناسبت کے لحاظ سے ''شکستِ پندار'' کیا ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1813 میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس وقت کے انگلستان کے متمول اور متوسط طبقے کے سماجی رجحانات، معاشرتی الجھنیں، اخلاقی عیوب، روزمرہ کے حالات اور دیہی علاقوں کے دلکش قدرتی مناظر کی مصوری حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی ہے۔

اس کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس کے بہت سے معاملات اور حالات ہمارے ملک سے مماثل ہیں۔

صفحات: 341، قیمت-/216 روپے

محمد رفیع انصاری

آب حیات

آج، ہم تمھیں اردو کی مشہور کتاب ''آبِ حیات'' کے بارے میں کچھ باتیں بتاتے ہیں۔ اس کتاب کو چھپے تقریباً ایک سو اٹھائیس سال بیت گئے ہیں، لیکن یہ آج بھی اردو زبان کی پسندیدہ کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1880 میں شائع ہوئی، اور پھر وقفے وقفے سے چھپتی رہی۔ ''آبِ حیات'' میں اردو شاعروں کے کلام، ان کی شخصیت، ان کے کلام کی خوبیوں، ان کے لطیفوں، ان کی مزے مزے کی باتوں کے ساتھ اردو شاعری کی تاریخ کا بیان بھی ہے۔

یوں تو اس سے پہلے بھی شاعروں کے تذکرے لکھے گئے مگر وہ ادھورے اور مختصر تھے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر بھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس کے علاوہ زیادہ تر تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تفصیل سے شاعروں کے حالات انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اب تم یقیناً اس کتاب کے مصنف کے بارے میں جاننا چاہو گے۔ اس کتاب کے مصنف شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد ہیں۔ آزاد 1823 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر علی دہلی کے عالمِ دین تھے۔ اردو کے مشہور شاعر ذوق سے ان کی گہری دوستی تھی۔ مولوی صاحب نے بیٹے کی بہت عمدہ تربیت کی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر انھیں دلی کالج میں داخل کیا گیا۔ جلد ہی آزاد کا شمار دلی کالج کے ہونہار لڑکوں میں ہونے لگا۔ مضمون نگاری کے مقابلے میں ہمیشہ وہ انعام پاتے۔ ابھی کالج کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مولوی باقر نے آزاد کو ذوق کی شاگردی میں دے دیا۔ ذوق نے آزاد کو شعر گوئی کی طرف مائل کیا اور جلد ہی اپنے شاگرد کو بڑے بڑے مشاعروں میں لے کر جانے لگے۔

محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر کی شخصیت بھی بڑی با کمال تھی۔ 1836 میں مولوی صاحب نے ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ اس میں خبروں کے علاوہ انگریزوں کی زیادتیوں پر تنقیدیں بھی کی جاتی تھیں۔ دہلی کے سبھی اہم ادیب اور شاعر اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔ جب انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کی شروعات ہوئی تو اخبار نے کھل کر آزادی کے متوالوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی حکومت نے مولوی محمد باقر پر ایک انگریز کو قتل کرنے کا الزام لگا کر موت کی سزا دی۔ محمد حسین آزاد کو جان بچانے کے لیے دہلی چھوڑنی پڑی۔ پہلے وہ لکھنؤ گئے اور پھر کسی طرح لاہور پہنچے۔ لاہور پہنچنے پر بھی ان کی مصیبتیں ختم نہیں ہوئیں۔ وہ نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے رہے۔ کسی طرح محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے اور یہیں سے انھوں نے رفتہ رفتہ لکھنے کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ محمد حسین آزاد نے اردو اور فارسی کی درسی کتابوں کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں ''آبِ حیات''، ''نیرنگِ خیال''، ''سخندانِ فارس''، ''دربارِ اکبری'' اور ''قصصِ ہند'' بہت مشہور ہیں۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے استاد بھی رہے۔ 1887 میں انھیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا۔

محمد حسین آزاد کی کتابوں میں ''آبِ حیات'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ مصنف نے کتاب میں شامل

شاعروں کو امرت رس پلا کر انھیں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا اور خود بھی امر ہو گئے۔ اس کتاب کو لکھنے میں آزاد کو پندرہ برس سے زائد کا عرصہ لگا۔ شاعروں کے حالات ایک جگہ جمع نہیں تھے۔ نہ کتابیں تھیں کہ جن سے کوئی معلومات حاصل ہو اور اگر کوئی کتاب کہیں تھی بھی تو اس کا معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ شاعروں کا کلام ڈھونڈنا بھی مشکل تھا، غرض کہ بہت سی دشواریاں تھیں جن کا آزاد کو سامنا تھا۔ پھر بھی انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ تحقیق و تلاش جاری رکھی بالآخر ایک لاجواب کتاب بنی، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1880 میں شائع کیا گیا۔

''آبِ حیات'' کی خوبیاں: محمد حسین آزاد کہتے ہیں کہ ''اردو زبان میں قدیم شاعروں کا کلام تو موجود تھا لیکن ان کی شخصیت، ان کے حالات اور ان کے کارناموں کے متعلق کہیں کوئی ٹھوس مواد موجود نہ تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ اس طرح تو آنے والی نسلیں ہمارے بزرگوں کے کارناموں سے نابلد رہ جائیں گی اور یہ بہت بڑا نقصان ہوگا چنانچہ میں نے سوچا کہ ان کی شاعری اور ان کی باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرح لکھا جائے کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آجائیں اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔''

اردو زبان کی ترقی اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کے لحاظ سے کتاب کو پانچ دور میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر عہد کے بیان میں اس دور کی زبان اور اس زمانے کی شان نظر آتی ہے۔

''آبِ حیات'' کا پہلا دور ولی کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور پانچواں دور میر انیس کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔ کتاب میں مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی، میر، شیخ قلندر بخش جرأت، میر حسن، انشاء اللہ خاں انشا، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، امام بخش ناسخ، آتش لکھنوی، شاہ نصیر، مومن خاں مومن، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب وغیرہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کسی کتاب میں ان کے متعلق اتنی ڈھیر ساری معلومات یکجا نہیں ملتیں۔ بعد میں یہ کتاب شاعروں پر لکھنے والوں کے لیے ایک مینارۂ نور بن گئی۔ کتاب صحیح معنوں میں ''خزانۂ معلومات'' ہے۔ اس کا اندازِ تحریر بہت پرکشش اور دلچسپ ہے۔ کوئی حصہ ایسا نہیں جو اکتاہٹ پیدا کرے۔

واقعات اور حکایات: یوں تو ''آبِ حیات'' میں بے شمار دلچسپ اور پرلطف واقعات جمع ہیں۔ یہاں ہم کتاب میں شامل بعض شاعروں کی مزے دار باتیں تحریر کرتے ہیں، جنھیں پڑھ کر تم بھی خوش ہوگے اور تمھارے بڑے بھی۔

کتاب میں امیر خسرو کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے۔ امیر خسرو بڑے کمال والے تھے۔ ان کا تعلق درباروں سے بھی تھا اور رعایا سے بھی۔ خسرو کی طبیعت بڑی ایجاد پسند تھی۔ انھوں نے غزلیں، اور کئی طرح کے گیت بھی کہے ہیں جن میں پہیلیاں، ان مل (بے میل، بے تکا)، کہہ مکرنی (ایک قسم کی پہیلی جس میں کہنے والا کہہ کر مکر جاتا ہے) اور دو سخنے بہت مشہور ہیں۔ محمد حسین آزاد نے خسرو کا ایک واقعہ لکھا ہے:

''ایک کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں، امیر خسرو کو راستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کنویں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انھیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو! خسرو یہی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے، جس کے گیت

سب گاتے ہیں اور پہیلیاں، مکرنیاں، انمل سنتے ہیں۔ انھوں نے کہا "ہاں"۔ اس پر ایک ان میں سے بولی کہ مجھے "کھیر" کی بات کہہ دے، دوسری نے "چرخہ" کا نام لیا۔ تیسری نے "ڈھول" چوتھی نے "کتے" کا۔ انھوں نے کہا مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی پلا دو۔ وہ بولیں "جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا، نہ پلائیں گے۔ انھوں نے جھٹ کہا:

"کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا، لا پانی پلا۔" شاعری کی اس قسم کو "ان مل" کہتے ہیں۔ خسرو کے دوسخنے کی ایک مثال بھی خوب ہے۔ اسے بھی آج تک لوگ سنتے اور سناتے ہیں۔ اب تم سوچوگے کہ یہ دوسخنے کیا ہوتا ہے تو بچو! ایسے دو مصرعے جن کا جواب ایک ہو، اسے دوسخنے کہتے ہیں۔ دیکھیے خسرو اس دوسخنے میں بڑے مزے کی بات کہتے ہیں۔

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا — گلا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا، سنبوسہ کیوں نہ کھایا — تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا — دانا نہ تھا

مرزا محمد رفیع سودا اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں شگفتگی اور زندہ دلی کے ساتھ ساتھ مزاج میں گرمی اور تیزی بھی تھی۔ وہ جس کسی سے ناراض ہوتے اس کے خلاف ایک نظم کہہ دیتے۔ ایسی نظم جس میں کسی کی برائی کا بیان ہو، اسے "ہجو" کہتے ہیں۔ سودا ہجو کہنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سودا کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"سودا کے غلام کا نام غنچہ تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلمدان (قلم دوات رکھنے کا بکس) لیے پھرتا تھا۔ سودا جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے "ارے غنچہ لا تو قلمدان میں اس کی خبر لوں، یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔"

میر تقی میر اور مرزا سودا میں کس کا درجہ بلند ہے، اس بات پر ان کے چاہنے والوں میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

"ایک دن میر (میر تقی میر) اور مرزا (مرزا محمد رفیع سودا) پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں ایک بزرگ خواجہ باسط کے مرید تھے، انھی کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور مرزا صاحب کا کلام "واہ" ہے۔

آب حیات کا یہ واقعہ بھی بیحد مشہور ہوا جو میر تقی میر کے متعلق ہے۔

شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں جب حکومت کا خزانہ خالی ہوگیا اور ہنرمندوں کی ناقدری ہونے لگی تو میر نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا۔ گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا چنانچہ ایک شخص کے ساتھ ہو لیے اور لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا (مسافر خانہ) میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کا پہناوا بڑا عجیب وغریب تھا، سر پر بڑی سی پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار (خنجر) ہاتھ میں جریب (لاٹھی)، وہ جب محفل میں داخل ہوئے تو شہر

لکھنؤ کے بانکے، جوان انھیں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن۔ پہلے ہی غمگین تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضور وطن کہاں ہے؟...... تب میر صاحب نے یہ مصرعے پڑھ کر تمام سننے والوں کو چونکا دیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

تب سب کو حال معلوم ہوا۔ ان سب نے اپنی نا سمجھی اور غلطی کی معافی مانگی۔

ایک شاعر گزرے ہیں شیخ قلندر بخش جرأت، ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ ''وہ جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ایک دن انشاء اللہ خاں انشا، ان کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع (غزل کا پہلا شعر) ہو جائے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا تب تک نہ سناؤں گا نہیں تو تم مصرع لگا کر چھین لوگے۔ سید انشا نے بہت ضد کی تب جرأت نے پڑھ دیا:

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی
(یعنی، اس زلف پر اندھیری رات کا گمان ہوا)
یہ مصرع سُن کر سیّد انشا نے فوراً کہا:
اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

بچو! یہ ہماری زبان کی بے مثال کتاب ''آبِ حیات'' کی کچھ باتیں تھیں جن سے تم یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوگے۔ بڑے ہو جانا تو اس کتاب کو تلاش کر کے ضرور پڑھنا، تمھارے علم میں بڑا اضافہ ہوگا۔

□□□

پتہ:
Al-Madni Complex,
734/Bhusar Mohalla,
Bhiwandi (421302)

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

کلیات سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساس دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے چوبیس سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا اس میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سراج کی قادرالکلامی مسلم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

دکنی لغت

مرتب: سیدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)

مرتبین — شمیم حنفی، مظہر مہدی

''آزادی کے بعد اردو نظم'' آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی بھی دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دو جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

آبشار اور آتش فشاں

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ''آبشار اور آتش فشاں'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور تائید و تردید میں مزید تشخیص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی یہ کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

Date of Publication : 24/05/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, June 2009, Vol. 11, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

”فکر و تحقیق“

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خلاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Hamidullah Bhat, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938